تھوڑے سے برے ہم بھی

آسیہ رئیس خان

وہ نانا جان کو دوا دے کر باہر آئی ہی تھی کہ دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجی۔

"دیکھو ذرا۔" اسے یقین تھا دوسری طرف بوا ہو گی۔ وہ کہتی اندر چلی گئی۔ ناول میں گم اروی نے سر اٹھا کے دیکھا۔ اگلے پل شتابی سے دروازے کی طرف گئی، پٹ کھولے اور دوبارہ اسی تیزی سے واپس آ کر کتاب اٹھا کے بیٹھ گئی۔

"کون ہے؟" جب بوا کی آواز آئی نہ کوئی آہٹ تو اس نے دروازے میں آ کر پوچھا۔ اروی نے کھلے دروازے کو دیکھا اور پھر ہونٹ بھینچتے ہوئے شانے اور سر ہلا کے لاعلمی کا اظہار کیا۔

وہ دوپٹا درست کرتی دہلیز پھلانگ کے باہر آئی۔

"ایسا بھی کیا ہے اس میں؟" اسے گھورتے ہوئے اس کی آواز میں جھلاہٹ تھی۔

"ایسا ہی ہے اس میں قدسی!" وہ اس سے تین سال چھوٹی تھی مگر باجی آپی اسے بچپن سے بولنا نہ آیا۔ سب کی نقل میں اس نے اسے قدسی پکارنا سیکھ لیا تھا۔

"بس ایک نظر اٹھا کے دیکھنا تھا کہ دروازے پر کون ہے۔" وہ کہتی عین دروازے کے سامنے پہنچی اور وہاں ایک اجنبی کو دیکھتے ہی سٹپٹا کے سنبھل گئی۔

اس کا حلیہ بتا رہا تھا وہ اس معمولی سے شہر کا باسی نہیں ہے نہ ان سے اس کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ شکل، حلیہ، انداز، لباس، ہر چیز 'امارت' چیخ رہی تھی۔ اگلی نگاہ اجنبی کے پیچھے سڑک کنارے کھڑی کار پر پڑی اور اسے یقین ہو گیا کوئی بھٹکا مسافر راستہ پوچھنے آیا ہے۔

"جی کہیے؟" اس یقین کے ساتھ وہ غلط جگہ آ گیا ہے، اس نے مقابل سے پوچھا۔

"زہرہ بانو کا گھر یہ ہی ہے؟" کچھ سخت، زیادہ سرد مگر بھاری سی آواز میں پوچھا گیا سوال اسے یک بیک چوکنا کر گیا۔ وہ نہ صرف صحیح پتے پر پہنچا تھا بلکہ وہ اس کی امی سے بھی واقف تھا۔

"جی۔" اور وہ جو سوچ رہا تھا کہ اس کی تلاش یہاں ختم نہیں ہو گی، تلاش ختم ہونے پر مطمئن ہونے کی بجائے مزید انتشار کا شکار ہو گیا۔

"کیا ان سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"نہیں۔" مقابل کی پیشانی شکن آلود ہوئی اور ابرو اونچے ہو گئے۔

"انھیں دنیا سے رخصت ہوئے چار برس ہو گئے ہیں۔" قدسیہ نے نہیں کی وجہ پیش کی۔ اب اس کی آواز میں اول والا اخلاق اور مروت نہیں رہی تھی۔

چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ زہرہ بانو کو پوچھنے والا انجان اور امیر شخص کہاں سے آ سکتا ہے مگر دماغ یقین کرنے سے انکاری تھا۔

چند پل وہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ وہ سوچ رہا تھا ابھی وہ اس کی آمد کی وجہ اور وہ کون ہے پوچھے گی اور قدسیہ سوچ رہی تھی اب اجنبی کا اگلا جملہ تعارف اور زہرہ بانو سے اس کا رشتہ ہو گا۔

"کون ہے قدسی؟" اروی نے پکارا۔

قدسیہ نے اسے جواب دینے کی بجائے وہی سوال چہرے پر سجا کے مقابل سے جواب طلب کیا۔

جواب ایسا سہل نہ تھا کہ وہ اپنا نام ظاہر کرتا اور وہ پہچان جاتی۔

"زہرہ بانو کے پہلے شوہر کی فیملی کافی وقت سے انھیں تلاش کر رہی ہے۔۔۔" اس نے تمہید باندھی اور قدسیہ کے چہرے پر سختی اور ناگواری پھیل گئی۔ یہ ہی اسے نہیں سننا تھا۔

"آپ ان کی بڑی بیٹی ہیں؟" اس نے تمہید مزید طویل کرنے کی بجائے سیدھی بات پوچھی۔

قدسیہ نے سختی سے ہونٹ بھینچ کر سر کو خفیف سی جنبش دی۔ یہ حقیقت اس نے آس پاس کے لوگوں سے کم ہی سنی تھی۔

"شجاع احمد کی بیٹی؟" اس کے سوال قدسیہ کو ذرا اچھے نہیں لگ رہے تھے۔

"ہوں۔" اس نے بند ہونٹوں سے ہامی بھری۔

"آپ کی دادی آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

شاکر اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا اور اس کی بات سن بھی چکا تھا۔

”یو مین۔۔۔“ اس کی حیران سی آواز قدسیہ کی تیز آواز میں دب گئی۔

”تم اندر جا کر نانا جان کو دیکھو میں آ رہی ہوں۔“ وہ بہن کے اشارے اور مزاج سمجھتا تھا لہٰذا نہ چاہتے ہوئے بھی اندر چل دیا۔ شہود نے جیب سے والٹ اور پھر والٹ سے کارڈ نکالا۔

”آپ جب ان سے ملنے ریڈی ہو کال کیجیے گا۔“ اس نے کارڈ والا ہاتھ آگے بڑھایا۔

وہ واضح طور پر متامل تھی اور وہ مزید لفظی اصرار کے ہاتھ سامنے کیے کھڑا تھا۔ آخر اس نے کارڈ لے لیا۔ شہود اس کے پیچھے صحن پر ایک نگاہ ڈال کے پلٹ گیا۔

اس نے اندر آنے کی اجازت مانگی نہ دوسری بات کی۔ قدسیہ نے بھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس قدر اچانک اور غیر مترقبہ آمد اور بات تھی کہ وہ ہمیشہ اس خاندان سے خفا رہنے والی، اس وقت نہ طیش میں آئی نہ برا لگا۔ بس حیرت تھی اور کچھ بے یقینی بھی۔

وہ وہیں کھڑی اسے کار تک جاتے، دروازہ کھول کے اندر بیٹھتے اور پھر کار ریورس کر کے سڑک پر ڈالتے دیکھتی رہی۔ شہود نے گیئر بدل کے رفتار بڑھانے سے پہلے بیک ویو مرر میں اسے دیکھا تھا۔

اس نے سڑک سے نظریں پھیر کے کارڈ کو دیکھا۔ ’شہود شفیع احمد‘ نام کے علاوہ اس پر صرف فون نمبر درج تھا۔

”یہ کون ہیں؟ اور اتنے برسوں بعد میری یاد کیوں آئی؟ کیا بدل گیا ہے ان کے لیے؟“

اس نے زندگی میں اپنے ددھیال کے کسی فرد کو نہیں دیکھا تھا تاہم اس نے اپنی ماں کو اس ذکر پر ہمیشہ اداس ہوتے دیکھا تھا۔ وہ خود سے یہ ذکر کبھی چھیڑتی نہ تھیں لیکن جب بھی بات نکلتی اسے اپنی ماں کے لہجے میں افسوس اور دکھ محسوس ہوتا تھا اور اس پر سب سے زیادہ اثر خالہ کی باتوں کا تھا۔ وہ اس معاملے میں سب سے زیادہ حساس، دکھی اور ناراض ہستی تھیں۔

دروازہ بند کر کے اندر آئی تو اروی نانا جان کو خبر دے چکی تھی۔

”یہ کارڈ دیا ہے۔“ اس نے انھیں کارڈ تھمایا۔

”کہہ رہے تھے۔۔۔ دادی۔۔۔ مطلب میری دادی ملنا چاہتی ہیں مجھ سے۔“ یہ خیال اور جملہ کس قدر اجنبی تھا۔

”اتنے عرصے بعد۔۔۔“ وہ کہنے جا رہے تھے کہ سوچ کر خاموش ہو گئے۔

کیا کیا یاد آ گیا تھا مگر اب خود عمر کے جس دور میں تھے وہاں اس پڑاؤ تک پہنچ چکے سبھی بوڑھوں کو بہتر سمجھنے لگے تھے۔ ان کے پاس انتقام، بدلہ، نفرت، طیش کی جگہ بس درگزر بچا رہ گیا تھا کہ وہ ہلکے ہو کر دنیا چھوڑنا چاہتے تھے تو دوسروں کو بوجھ سے آزاد کرنے کی اہمیت بھی سمجھتے تھے۔

”مل لو۔۔۔ آخری عمر میں بوڑھوں کی موت آسان ہو سکے اس سے اچھا اور کیا ہو گا۔“ انھوں نے کارڈ واپس اس کی طرف بڑھایا۔

اروی اور وہ، دونوں ان کی بات پر تڑپ گئیں۔ آج کل بے ارادہ ہی وہ یوں مایوس اور اداس باتیں کر جاتے تھے۔

”پوچھا نہیں تم نے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟“ ان کی شکلیں دیکھتے ہوئے انھوں نے خود ہی بات بدل دی۔

”نہیں۔ اچانک یہ سن کر کچھ سمجھ ہی نہیں آیا۔“ اس نے کارڈ کو گھورا۔

”فون کر کے پوچھ لو بیٹا۔ کیا پتہ بیمار ہو، ماضی جو بھی تھا انھوں نے اب یاد کیا ہے تو دل بڑا کر کے مل آؤ۔“

”دیکھوں گی۔ آپ آرام کریں اب، اروی چلو تم بھی ورنہ نانا جان سوئیں گے نہیں۔“ اس نے کھڑکی کے پردے کھینچ کے کمرے میں سونے کا ماحول بنایا۔ اسپتال میں باری کے انتظار میں بیٹھنا انھیں ہمیشہ تھکا دیتا تھا۔

اروی اٹھ کر چلی گئی۔ اس نے پلنگ کے پاس آگے چادر ان کے پیروں پر پھیلائی اور فون ان کے تکیے کے پاس رکھا۔

”مجھے بلانا ہو تو کال کیجیے گا، فون یہاں ہے۔“

”ہمم۔“ انھوں نے سر ہلایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ آواز پیدا کیے بغیر دروازہ بھیڑ کے کمرے سے باہر آگئی۔

اروی نے پھر اپنی کتاب اٹھالی تھی مگر پڑھنے کی بجائے وہ اس کے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔

”تم فون کرو گی؟“

”پتہ نہیں۔“ اس نے کارڈ کو دیکھا اور کمرے میں آگئی۔ پہلی بار اروی کا دل کہانی میں آگے کیا ہوگا کی بجائے اب گھر میں کیا ہوگا میں الجھا تھا۔

قدسیہ نے کارڈ میز پر اچھال دیا اور بستر پر گر گئی۔ اسپتال کی بھاگ دوڑ اور ڈاکٹر کی باتوں نے اسے ذہنی جسمانی دونوں طور پر تھکا دیا تھا، اس پر مستزاد اجنبی کی آمد اور مدعا!

”خالہ کو بتاؤں؟“ فوراً خود ہی اس سوال کو رد بھی کر دیا۔

”نہ۔ اس وقت دوسرے زیادہ اہم مسئلے سامنے ہیں۔“

کئی دنوں سے نرم گرم طبیعت چل ہی رہی تھی لیکن جب ایک دن اچانک نانا جان چکرا کے گر گئے تو ان تینوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ زہرہ بھی یونہی گری تھیں اور پھر دوبارہ آنکھیں ہی نہیں کھلیں ان کی۔ اسپتال میں انھیں ہوش تو آیا مگر ایک لمبی قطار تھی تفتیشات کی جس کے بعد اسے ڈاکٹر نے وہ خبر سنائی تھی۔ قدسیہ کو وہ بھاری بھرکم الفاظ بالکل سمجھ نہیں آئے تھے مگر یہ صاف سمجھا تھا کہ نانا جان کے دماغ میں ایک ایسی جگہ ٹیومر ہے جو ان کی زندگی بے حد مشکل ہی نہیں کرے گا بلکہ آہستہ آہستہ جینا اجیرن کر دے گا۔ اسے جلد سے جلد نکالنا ضروری تھا اور اسے نکالنا کوئی معمولی سرجری نہیں تھی۔

اس نے ذرا سا اچک کے میز سے فون اٹھایا اور اس ضروری جراحت کے لیے مخصوص نجی اور سرکاری اسپتال، سہولیات اور اخراجات دیکھنے لگی۔ وہاں پریشان اور فکر مند ہونے اتنا کچھ تھا کہ وہ کارڈ اور اجنبی ذہن سے مکمل محو ہو گئے۔

☆☆☆☆

وہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ یہ اطلاع بی اماں کو دے یا نہیں۔ ظاہر تھا یہ جان کر کہ ان کی پوتی اسے مل گئی ہے، وہ خوش ہو جاتیں مگر پوتی کا فیصلہ اس خوشی کو قائم رکھنے والا ہو گا یا نہیں، ابھی اسے یہ علم نہیں تھا۔

"آج پھر اسی تلاش میں خوار ہوتے رہے؟" کار سے نکلا ہی تھا کہ پیچھے سے نیلوفر چاچی کی آواز آئی۔ دفتر سے وہ عموماً اتنی دیر سے گھر نہیں آتا تھا۔

"مجھے اور بھی کام ہوتے ہیں نیلو چاچی۔" وہ مسکرایا۔

"ان کی ضد کے پیچھے یہاں وہاں بھٹکنے کی بجائے انھیں سمجھاؤ، انھیں صرف تمھاری بات سمجھ آتی ہے۔"

"جی۔ میں دونوں کام کرتا ہوں۔" وہ ان کے پاس پہنچ گیا تھا۔

"باقی سب کہاں ہیں، بڑی خاموشی ہے اندر۔" نیلوفر نے جتاتی گہری نظر اس پر ڈالی۔

"تمھیں کھوجی بننے سے فرصت ملے تو یاد رہتا کہ آج عراضہ کے میچ جیتنے کا سلیبریشن ہے۔"

"اوہ!" اس نے تاسف سے سر پر ہاتھ رکھا۔

"کہاں گئے ہیں؟" وہ واپس کار کی طرف بڑھا۔

"ہورائزن۔" انھوں نے ریستوراں کا نام بتایا۔

"تھینک یو۔" اس نے کار کا دروازہ کھول کر انھیں دیکھا اور اندر بیٹھ گیا۔

وہ گیٹ سے باہر جاتی کار کو دیکھ رہی تھیں تب سعیدہ باہر آئیں۔

"ابھی آیا اور اب کہاں نکل گیا؟"

"یاد دلایا میں نے، ادھر ہی گیا ہے۔" انھوں نے مسکرا کے جٹھانی کو دیکھا۔

"اچھا۔" انھوں نے سر ہلایا مگر چہرے پر تھکے ماندے بیٹے کے لیے فکر تھی۔

"اور کتنا اس بچے کو خوار کریں گے؟ اب وقت آ گیا ہے، ہم سب مل کر بی اماں کو قائل کریں کہ وہ یہ ضد چھوڑ دیں۔ آپ بھی دیکھ ہی رہی ہیں شہود اس تلاش میں خود کو بھی بھول بیٹھا ہے۔" جٹھانی کا فکر مند چہرہ انھیں گرم لوہا محسوس ہوا تبھی ضربیں لگانی شروع کر دیں۔

"دعا کرو نیلوفر بی اماں کی خواہش پوری ہو، شہود کی محنت رنگ لائے، شجاع کی بیٹی مل جائے۔" سعیدہ، گرم لوہا تو نہیں بلکہ ان کے نزدیک چکنا گھڑا ثابت ہوئیں۔

"ہمم۔" انھیں مزید توانائی برباد کرنے میں دلچسپی نہیں تھی۔

بیمار ساس کی وجہ سے ایک عرصہ ہوا گھر میں بچوں کے جشن اور ہنگامے بند تھے، ان سب کا کہیں آنا جانا بھی کم ہو گیا تھا۔ ایک عرصہ ہوا، ان کی طبیعت اور مزاج نے گھر میں ایسے ہنگاموں اور محفلوں کا وجود ختم کر دیا تھا۔

☆☆☆☆

انھیں واپسی میں خاصی دیر ہو گئی۔ نادر بھی ساتھ تھا مگر اس وجہ سے آج اس کا مزاج خراب نہیں ہوا تھا بلکہ کسی وجہ سے وہ آج زیادہ مسکرا رہا تھا۔ اس دروازے سے بنا کسی مثبت اشارے کے لوٹنے کے بعد جو کوفت تھی، وہ ختم ہو گئی تھی۔

وہ سیدھا بی اماں کے کمرے میں آیا۔ وہ سو رہی تھیں۔

''اچھا ہی ہوا آج انھیں جواب دینا، جھوٹ کہنا مشکل ہوتا۔'' اس نے ان کے پژمردہ اور بیمار وجود کو دیکھ کر سوچا۔ دنیا کے لیے وہ ایک سخت گیر اور خود غرض انسان تھیں اور جو کچھ اس نے سنا تھا، اسے لگتا تھا لوگ درست سوچتے ہیں مگر وہ ان سب کے لیے مشفق دادای تھیں۔ خاص طور وہ اور نادر یعنی ان کے دونوں پوتے انھیں بے حد عزیز تھے۔

اپنے کمرے میں آ کر جیبیں خالی کرتے ہوئے اسے اپنا کارڈ آیا اور اس نے بے اختیار فون روشن کر کے کال لاگ دیکھا کہ کہیں کسی نئے اور اجنبی نمبر سے کال مس تو نہیں ہوئی۔

''اتنی جلدی کہاں!'' فون رکھتے ہوئے اس نے سر جھٹکا۔

''جو اس کا انداز اور ری ایکشن تھا لگتا تو نہیں ہے کہ وہ کال کرے گی۔'' ماں کا نام اور دادی کی خواہش سنتے ہی بدلا چہرہ اس کے تصور میں ابھرا۔

''جب تک وہ کال نہیں کرتیں، میں اس فیملی کے متعلق سب کچھ معلوم تو کر سکتا ہوں۔'' جتنی شدید بی اماں کی خواہش تھی کہ وہ دنیا چھوڑنے سے پہلے شجاع چاچا کی بیٹی سے ملے، کچھ دن پہلے تک اتنا ہی وہ بھی بے چین تھا کہ کس طرح وہ یہ کر دکھائے۔ مگر جب سے سعیدہ نے بی اماں کی تڑپ اور تمنا کی اصل وجہ اسے سنائی تھی، وہ عجیب کشمکش میں تھا۔

وہ پھر جلد اپنے شہر سے دور اس چھوٹے شہر میں جانے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔

اُدھر سونے سے پہلے اروىٰ نے اس سے پوچھا تھا۔

''پھر کیا سوچا ہے؟''

''کچھ نہیں سوچا اور تم سو جاؤ، میں بس ایک بار آواز دوں گی۔'' اس نے دھمکی دی۔

''دوسری دفعہ فین بند کر دینا بس۔'' اس نے چادر اوڑھ کے آنکھیں بند کر لیں کہ قدسیہ زبان کی پکی تھی اور وہ کل کالج کا ناغہ نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے بتی بجھائی اور لیٹنے کی بجائے میز کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ سامنے ہی کارڈ پڑا تھا۔ پھر اسے خالہ کو فون کرنے کا خیال آیا۔ بات ہی ایسی تھی کہ انھیں اطلاع دینے کی سوچ بڑی فطری تھی۔ مگر موجودہ صورت حال میں اس کی ترجیح یعنی نانا جان کی صحت کا خیال بھی اس قدر حاوی تھا کہ ماحول رنجیدہ اور کھنچا ہونے کا تصور خالہ کو فون نہ کرنے کی ترغیب بھی دے رہا تھا۔

دادی اور ددھیال سے اسے خالہ نے ہی مفصل متعارف کروایا تھا جو خوش کن نہیں تھا۔ کچھ بعید نہ تھا کہ کارڈ استعمال کر کے خالہ ہی وہاں پہنچ جاتیں اور برسوں کا جمع غصہ اور باتیں سنا کر انھیں پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کرنے کا حکم دے آتیں بلکہ قوی امکان تھا خالہ کی تلخ باتیں سن کر وہ ہی اس نئی نئی جاگی محبت پر دو حرف بھیج دیتے۔

اس نے کارڈ ہاتھ میں لے کر پھر نام اور نمبر پڑھا۔

”مجھے تو اپنے تایا چاچا کے نام بھی نہیں معلوم۔“ اس نے کارڈ واپس میز پر رکھ دیا۔

اس کے پاس فکر کرنے کے لیے اس سے زیادہ ضروری اور اہم باتیں تھیں۔ باتیں کیا ضرورتیں، پریشانیوں کی صورت سامنے کھڑی تھیں۔

ماموں سے اسے کوئی امید نہیں تھی۔ جب سے نانا جان نے مکان بیچنے سے منع کیا تھا، وہ محض ناراض نہیں تھے بلکہ مروت بھی بھول گئے تھے۔ خالہ کے حالات کسی سے پوشیدہ نہیں تھے۔ ایسے میں نانا جان کے علاج کے لیے پیسوں کا انتظام اس کی ہی ذمہ داری تھا۔ بار بار اس کا ذہن بھٹک کے ماں کے زیورات کی طرف جا رہا تھا جو ان دونوں کی شادی کے نام پر رکھے تھے۔ وہ بھی کوئی زیادہ مالیت کے نہ تھے مگر جتنے بھی تھے، وہی جمع پونجی تھے۔ اگر وہ ان کے ذریعے پیسوں کے انتظام کا سوچ رہی تھی تو یہ کام اسے سب سے چھپا کے کرنا تھا، خالہ سے بھی چھپا کے۔ اس سے پہلے اسے اس نیورو اسپیشلسٹ سے ملنا تھا جس کا کارڈ نانا جان کے ڈاکٹر نے اسے دیا تھا۔ جس کی کنسلٹنگ فیس نے ہی اس کی نیندیں اڑا دی تھی۔

☆☆☆☆

”کیا مجھے دوبارہ وہاں جانا چاہیے؟“ اس نے سعیدہ کو بھی نہیں بتایا تھا کہ بی اماں کی پوتی مل گئی ہے۔ اگر وہ ملنے سے صاف انکار کر دیتی تو وہ زبردستی نہیں کر سکتا تھا اور جب تک کوئی مثبت پیش قدمی نہ ہو وہ کسی کو امید یا نوید نہیں تھمانا چاہتا تھا۔

وہ خود بستر مرگ پر تھیں مگر اب تک اپنے جواں سال بیٹے کی بے وقت موت بھولی نہیں تھیں۔ سارا خاندان ان ہی ان کی شجاع چاچا سے غیر معمولی محبت کا گواہ تھا۔

”کہاں تھے کل؟“ دستک دے کر سعیدہ اندر آئی تھیں۔

”بہت دیر سے آئے۔“

”آفس میں میٹنگ دیر تک چلی تھی۔“ اس نے ان کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔

”عراضہ کی پارٹی دن بھر یاد تھی لیکن شام ہونے تک بالکل ذہن سے نکل گئی۔“

”خیر! کوئی بات نہیں ہو جاتا ہے۔“ انھیں بیٹے کی مصروفیت کا اندازہ تھا۔

”آج بی اماں کا اپائنمنٹ ہے۔“ اس نے یاد دلایا۔

”ہاں تمھارے پاپا اور شعیب لے جائیں گے۔“ جب اگلا اپائنمنٹ ملا تھا تب ہی اس نے کہہ دیا تھا اس دن اہم ملاقات کی وجہ سے وہ نہیں جا پائے گا۔

”میں آفس کے بعد ڈاکٹر سے ملنے جاؤں گا۔“ اسے خود ڈاکٹر سے سننا اور پوچھنا پسند تھا۔

”ہمم۔“ سعیدہ نے اسے بغور دیکھا۔

”کچھ پتا چلا زہرہ کا؟“ یہاں سب اب تک انھیں حیات ہی سمجھتے تھے۔ سب کا خیال تھا وہ اپنی ازدواجی زندگی میں مشغول اور مصروف ہیں۔

”نہیں۔“ اس نے گھڑی پہننے کے بعد لیپ ٹاپ اور چارجر بیگ میں رکھا۔

”آج بھی دیر ہو گی؟“

”شاید۔ ہاسپٹل میں کتنا وقت لگے گا کہہ نہیں سکتا۔“

☆☆☆☆

وہ اسپتال کے لیے نکل رہی تھی اسی وقت خالہ کا فون آ گیا۔ نانا جان کا احوال پوچھنے کے بعد انھوں نے عادتاً پوچھا۔

”اور کوئی نئی خبر؟“

”ابھی میرا دماغ، اسپیشلسٹ کیا کہتا ہے اسی میں الجھا ہے، وہ ہاسپٹل اتنا بڑا ہے وہاں بل سمیت سب ہی بڑا ہو گا۔ شام میں فرصت سے بات کرتی ہوں۔“ ان سے جھوٹ کہنا اسے مشکل لگتا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ فکر نہ کرو سب بہتر ہو گا۔ مالک کوئی راستہ بنا ہی دے گا۔“

راستہ تو ڈاکٹر نے بڑا واضح بتا دیا تھا۔ نانا جان کی صحت ممکن تھی، بس اس راستے کے اخراجات کہاں سے پورے ہوں یہ سوال باقی تھا۔ اس کا جواب اسے ہی ڈھونڈنا تھا۔

اب تک نانا جان کی پینشن اور اس کے ابا یعنی سوتیلے ابا کے انتقال کے وقت دفتر سے ملے واجبات سے خریدی گئی دکان کا کرایا ہی تھا جو ان کا گھر چل رہا تھا۔ سب سے بڑی راحت نانا جان کا اپنا ذاتی مکان تھا ورنہ تو کرایے نے ہی ان کی کمر توڑ دینا تھی۔

ماموں اور خالہ کے حالات بھی ان جیسے تھے۔ چاچا اور دونوں پھپھو معاشی طور پر مستحکم تھے مگر وہ ان سے دور ہی رہتے تھے۔ ہاں اروی اور شاکر سے فون پر رابطہ رکھتے تھے۔

وہ سر جھکائے نانا جان کی فائل سینے سے لگائے چلی جا رہی تھی کہ سامنے کسی کے آ جانے پر معذرت کرتی ایک جانب ہو گئی۔

”ہیلو۔“ مقابل نے آگے جانے کی بجائے اسے مخاطب کیا۔ قدسیہ نے سر اٹھایا۔ وہ وہی اجنبی تھا جس کے دیے کارڈ پر شہود شفیع احمد لکھا تھا۔ اگر وہ اس پتے پر نہ پہنچا ہوتا تو دونوں ایک دوسرے کو جانے پہچانے بنا پاس سے گزر جاتے۔

”آپ یہاں؟ سب خیریت تو ہے؟“ اسے یہ سوال بڑا مصنوعی لگا۔

وہ اس کے بارے کیا جانتا تھا جو فکر مند ہوتا۔ اگلے پل دل نے سمجھایا کہ اسپتال میں دیکھ کر سب کے ذہن میں یہ ہی سوال اٹھتا ہے۔

”جی نانا جان کے ڈاکٹر سے ملنا تھا۔“ اس نے تمیز سے جواب دیا۔

”وہ بیمار ہیں؟“

”جی۔“

”بی اماں یعنی دادی بھی بیمار ہیں۔“ اس نے کہا تاکہ وہ سمجھ سکے کہ وہ کیوں اس کے سرد رویے کے باوجود اس وقت بھی اس سے بات کر رہا تھا۔ قدسیہ کو کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ نانا جان کی طرح دادی سے کوئی دلی لگاؤ تھا نہ محبت تھی۔

”آپ نے کچھ سوچا پھر ان سے ملنے کے تعلق سے؟“ جب وہ چپ رہی تو شہود نے پوچھا۔

قدسیہ نے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔ سیاہ پینٹ اور سرمئی سفید دھاریوں والی شرٹ میں، انداز میں اتھارٹی، دن ڈھلے بھی سلیقے سے جمے بال اور چہرے کی بشاشت سے وہ کسی عالیشان، آرام دہ دفتر کا باس ہی لگ رہا تھا۔ اور اس وقت اسے لگا وہ اسے اپنی ماتحت ہی سمجھ رہا ہے لہٰذا اسے ضروری محسوس ہوا اس کی یہ غلط فہمی دور کر دی جائے۔

”ہماری اپنی ایک زندگی ہے، اس کے مسائل اور کام ہیں۔ آپ کے آمد سے وہ سب رک نہیں گئے ہیں کہ اب آپ کے سوال کے علاوہ کچھ نہیں بچا جس پر سوچا جائے۔“ اس نے اپنی بھوری آنکھیں اس سے ہٹائیں۔ دوپٹے کا دوسرا سرا ابھی شانے پر ڈالتے ہوئے اس کے ہاتھ میں پکڑی فائل سے کاغذات نیچے گر گئے۔ وہ پرس، دوپٹا اور فائل سنبھالتی، جھکتی اس سے پہلے شہود نے جھک کے کاغذات اٹھا لیے۔ فوراً اسے دینے کی بجائے اس نے وہ ہاتھ نیچے گرا لیا۔

”ایک بیمار بزرگ گھر میں موجود ہو تو آپ دوسرے عمر رسیدہ مریض کی بے تابی اور مایوسی سمجھ سکتی ہیں۔“ وہ تلخی کی حد تک سنجیدہ تھا۔

”آپ چاہیں تو چوبیس گھنٹوں میں سے تیس منٹ تو نکال ہی سکتی ہیں۔“ اس نے کاغذ اس کی طرف بڑھائے۔

”اگر آپ التجا، گزارش اور ڈیسپیریشن سننا چاہتی ہیں تو پلیز۔۔۔ پلیز اپنی دادی سے چند منٹ کے لیے ملنے کے بارے میں سوچیے، بہت احسان ہو گا۔“ قدسیہ کے چہرے پر ناگواری پھیلی مگر وہ چپ چاپ کاغذات لے کر فائل میں رکھنے لگی۔

”اتنا کافی ہے یا گڑگڑاتے ہوئے ہاتھ جوڑ کے کہنا ہوگا۔“

”بنا طنز کے بات مجھے زیادہ بہتر سمجھتی ہے۔“ فائل بند کر کے اس نے مضبوطی سے پکڑ کے سینے سے لگائی۔

”میں نے کبھی ان کی شکل دیکھی نہ اپنے والد کے خاندان سے کسی شخص کو آتے جاتے یا فون کرتے دیکھا۔ ایک دن اچانک میرے دروازے پر پہنچ کر آپ کہتے ہیں بیمار دادی سے مل لو۔۔۔ اور توقع یہ ہے کہ میں فوراً آپ کے پیچھے چل بھی پڑوں۔ تو سنیں اور یاد رکھیں، آپ سب میرے لیے ویسے ہی اجنبی ہیں جیسے اس ہاسپٹل میں آتے جاتے یہ لوگ۔“ اس نے اپنے اطراف نظر گھمائی۔

”آپ کو ڈس اپائنٹ کرنے کے لیے سوری مگر دادی اور ان سے ملنا میری سب سے لاسٹ پرائرٹی ہے۔ آپ نہ کل میری دنیا میں تھے نہ آج ہیں۔“ وہ رکی نہیں۔

وہ ہمیشہ اس اسپتال میں آتا تھا اور وہ آج پہلی بار آئی تھی۔ شہود نے مڑ کے اسے جاتے دیکھا۔ اسے جانے کیوں اس کے مزاج اور انداز میں دادی کی جھلک دکھائی دی۔

☆☆☆☆

”ہیں!“ خالہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھیں۔

”وہ گھر آیا اور کہا دادی ملنا چاہتی ہیں؟“ ان کی بے یقینی پر وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

”ہاں خالہ۔“

”کیسے بے غیرت لوگ ہیں۔“ وہ واپس بیٹھ گئیں۔

”اب قبر میں پیر لٹک رہے ہیں تو گناہوں کی یاد ستا رہی ہوگی۔۔۔ اس سے زیادہ خودسر عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔“ انھیں کبھی وہ پسند نہیں تھی۔ خالہ نے ہی اسے ایک ایک بات بتائی تھی ورنہ اس کی امی تو ذکر ہی نہیں کرتی تھیں۔

”لیکن دیکھو ذرا جو احساس ہو، شرم ہو۔۔۔ منہ اٹھا کے اب ملنے کا حکم۔ ہم تو جیسے غلام ہیں ان کے۔ ہماری مرضی خوشی تو کچھ نہیں ان کے آگے۔ بس ایسے ہی حکم تھا ان کا کہ زہرہ دوسری شادی نہ کرے۔ ساری جوانی، اپنی بقیہ زندگی ان کے لاڈلے کی بیوہ بن کے رہے۔ وہ تو ابا مضبوط تھے، آپا کو لے آئے اور تمھارا کیس بھی لڑا۔ ابا ان کے رعب میں نہ آئے ورنہ تو گھٹ گھٹ کے مر جاتی آپا۔“ وہ تصور سے ہی آبدیدہ ہو گئیں۔

”چھوڑیں خالہ اتنا غصہ نہ کریں۔“ اس نے بات بدلی۔

”بچے کہاں ہیں؟“

”دانیال کوچنگ کو گیا ہے اور دانیہ کالج سے آئی نہیں ہے۔“ انھیں بھی اہم بات کا خیال آیا۔

”اب ابا کے آپریشن کے لیے پیسوں کا انتظام کہاں سے ہوگا؟ میں بھائی سے بات کروں؟“

”کوئی فائدہ نہیں خالہ۔ ان کے تو بہانے بھی اب یاد ہو گئے ہیں اور وہ پھر مکان بیچنے کا مسئلہ لے آئیں گے کہ ان پیسوں سے نانا جان کی سرجری ہو جائے گی ان کا حصہ نکالنے کے بعد۔“

آخری بار جب وہ گھر آئے تھے تو نانا جان نے بڑی بے بسی اور دکھ سے کہا تھا۔

”مجھے مر تو جانے دو پھر میری جائداد کے وارث بننا۔“

اب وہ بالکل بھی یہ ذکر چھیڑنا نہیں چاہتی تھی۔

خالہ کے یہاں سے گھر جاتے ہوئے وہ پیسوں کا ہی سوچتی رہی۔ نجی اسپتال میں علاج کا خرچ بہت زیادہ تھا اور سرکاری اسپتال میں اس پیچیدہ سرجری سے ڈاکٹر منع کر رہے تھے۔ نانا جان کی عمر بھی ایک بڑی وجہ تھی۔

نانا جان تو اپنی طرف سے انکار کر چکے تھے کہ انھیں سرجری نہیں کروانی۔ دواؤں سے جب تک کام چلتا رہے وہ دوائیں لیں گے اس کے بعد اللہ مالک ہے۔ اس نے انھیں بتایا بھی نہیں تھا کہ وہ دوسرے شہر کے اس بڑے اسپتال میں اسپشلسٹ سے ملنے جا رہی ہے۔

گھر پہنچی تو اروی ناول لیے بیٹھی تھی اور شاکر کالج سے آیا نہیں تھا۔

”خالہ اور خالو نے سلام کہا ہے نانا جان۔“ وہ فائل اپنے کمرے میں رکھ کے ان کے پاس آئی جو ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

”وعلیکم السلام۔ زیادہ دیر کر دی آج۔“

”دانیہ کے آنے کا ویٹ کر رہی تھی وہ کالج سے آئی نہیں تھی۔“ اس نے آدھا سچ کہا۔ نانا جان سمجھے وہ اس سے مل کر آئی ہے جب کہ وہ دانیہ کے آنے سے پہلے نکل گئی تھی۔

”کل جو لڑکا آیا تھا۔۔۔“ انھیں یاد تھا۔

”کیا نام بتایا اس کا؟“

”شہود، شہود شفیع احمد۔“

”یعنی وہ تمھارے تایا کا بیٹا ہے۔ اسے کہہ دو کہ تم کسی دن جا کے مل آؤ گی اپنی دادی سے۔“

کبھی نانا جان اسی دادی کے خلاف ڈٹ کے کھڑے تھے۔ اپنی کم مائیگی اور کم حیثیت کے باوجود انھوں نے عدالت میں کیس جیتا اور دادی کو اسے زہرہ سے الگ کرنے نہیں دیا تھا اور اب وہ ہی اسے جا کے اس عورت سے ملنے کہہ رہے تھے۔

”نانا جان! آپ کیسے مجھے ان کے پاس جانے کہہ رہے ہیں؟“ اس کی حیرت کی انتہا نہیں تھی۔

”پہلے تو انھوں نے امی کے ساتھ جو کیا وہ کیا مگر اس کے بعد پلٹ کے خبر تک نہ لی اور دونوں خطائیں ایسی ہیں جسے یوں ایک بلاوے پر بھلایا نہیں جا سکتا۔“

”بیٹا آخری عمر میں ایک بیمار اور بے بس انسان سے کیسا بدلا؟“

”یہ اچھا ہے یعنی وہ اپنے کیے کی سزا کبھی نہیں پائیں گی۔ میں انھیں ان کیا لوٹا نہیں سکتی کہ اب وہ بوڑھی ہو گئی ہیں؟“

”تم اسے اپنا امتحان سمجھو۔ دادی کا معاملہ وہ جانے اور اوپر والا۔ تم طاقت رکھتے ہوئے درگزر کر دو تو سرخرو ہو گی۔“ وہ اسے رسان سے سمجھا رہے تھے۔

”نہ نانا جان!“ اس نے قطعیت سے کہا۔

”معاف نہ کرنے پر کوئی گناہ نہیں ہے میرا دل نہیں مانتا تو میں کیوں ڈرامہ کروں؟ یہ منافقت نہیں ہو گی مجھ سے۔“

”اچھا ٹھیک ہے غصہ نہ کرو۔“ انھوں نے مزید قائل کرنے کا ارادہ ترک کیا۔

”ویسے تمھاری تائی، زہرہ کی اچھی سہیلی تھی۔ بعد میں بھی کئی سال رابطہ رکھا پھر ایک دو بار فاروق اور زہرہ کی اس بات پر بحث ہو گئی تو زہرہ نے خود رابطے ختم کر لیے تھے۔“ یہ اس کے لیے نئی اطلاع تھی۔

”آپ کیا کھائیں گے؟“ اس نے بات ختم کر دی۔

☆☆☆☆

رات وہ باورچی خانہ سمیٹ کر کمرے میں آئی، اروی سوئی نہیں تھی۔

”تم کیوں دیر تک جاگنے لگی ہو؟“

”دو دن ہوئے بس۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا تھا اس لیے۔“

”کیا؟“ اس نے اپنے بال کھولتے ہوئے پوچھا۔

”کیا سوچا پھر۔۔۔ کل جو کارڈ دے کر گئے ہیں؟“

قدسیہ کی مایوسی واضح تھی۔ اسے لگا تھا وہ کوئی کام کی بات کرنے جاگ رہی ہے۔

”کچھ نہیں سوچا۔ ابھی اتنے اہم کام ہیں اور تم اس فضول بات کے لیے جاگ رہی ہو۔۔۔؟ سو جاؤ فوراً۔“

اس نے تیل کی شیشی اٹھائی۔

”ورنہ میرے سر میں تیل لگا دو۔“ اروی کی جان جاتی تھی اس کام سے مگر اس وقت وہ اسے حیران کرتی شیشی لے کر اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔

”تم جا کے دیکھو تو۔ ایک بار ملنا بنتا تو ہے وہ لوگ اتنے رچ ہیں۔۔۔“

”اتنے رِچ کے اتنے برسوں میں مجھے ڈھونڈ نہ سکے!“ اس کی آواز تلخ اور لہجہ طنزیہ تھا۔

”دیکھو! یہ جذباتی ہونے کا وقت نہیں ہے۔ دنیا ایسے فنکشن نہیں کرتی۔ تعلق، ری سورس، پاور فل بیکنگ یہ سب بہت ضروری ہے اور تم برسوں پرانی بات پر ان سب کو لات نہ مارو۔ وہ مطلب کے لیے آئے ہیں کہ دادی کا آخری وقت ہے تو ہم بھی اپنا مطلب کیوں نہ دیکھیں؟“

”کیونکہ ہم ان جیسے نہیں ہیں۔“

”یعنی ہم بے وقوف ہیں۔“ اروی نے جل کے کہا۔

”اصول اور عزت نفس بھی کوئی چیز ہے۔“ قدسیہ نے یاد دلایا۔

”وہ ’کوئی چیز‘ ہے مگر ضرورت، پیسہ، کام یابی بھی اہم چیزیں ہیں۔“ اس کے ہاتھ زبان کی طرح ہی طراری سے چل رہے تھے۔

”یہ بے کار کے فلسفے سیکھ رہی ہو تم کتابوں سے؟“

”تم جو سوچ رہی ہو وہ بے کار بات ہے، نرے جذبات۔ جب کہ اللہ نے عقل سلیم بھی عطا کی ہے اور سب سے اہم۔۔۔“ وہ تیل سے سنے ہاتھ لے کر اس کے سامنے آئی۔

”تم وارث ہو۔ تمہارے دادا، تمہارے فادر سے پہلے فوت ہو گئے تھے یعنی ان کے بعد جو جائداد تمہارے فادر کو ملی اس میں تمہارا اور امی کا حصہ تھا۔“ وہ جانتی تھی اروی لالچی یا خود غرض نہیں ہے اور وہ جذباتی اور احمق تو قطعی نہیں تھی بلکہ وہ گھر میں سب سے زیادہ ’پریکٹیکل‘ تھی۔

”تم الٹا سر درد کر رہی ہو تیل لگا کے۔“

”میں ایسی کمال مالش کرتی ہوں ابھی بس تم وعدہ کرو اس بات کو اینڈ نہیں کرو گی انکار کر کے!“

”اچھی زبردستی ہے۔۔۔“

”قدسی! یہ غلطی نانا جان اور امی نے برسوں پہلے کی تھی، تم نہ کرو۔“

”سوچوں گی اور تم مساج کرو ورنہ سوچوں گی بھی نہیں۔“ اس نے دھمکی دی اور وہ کارگر ثابت ہوئی۔ اروی نے واقعی بڑی اچھی مالش کی۔

اروی تو سو گئی مگر ’کمال مالش‘ کے بعد بھی اس کی نیند اڑ گئی تھی۔

اسے نانا جان کی سرجری کے لیے راستہ دکھائی دینے لگا تھا جو غلط بھی لگ رہا تھا اور ضروری بھی۔

☆☆☆☆

شجاع احمد نے پسند سے شادی کی تھی۔ زہرہ ان کے ساتھ کالج میں تھیں۔ یہ چاند سورج کی جوڑی طبقاتی فرق کے باوجود سب کی رضامندی اور خوشی سے ایک ہوگئی تھی۔ شجاع احمد صحیح معنوں میں زہرہ کے پیچھے پاگل تھے۔ ان کی محبت معمولی نہیں تھی۔ زہرہ کا معاملہ ایسا شدید نہ تھا مگر وہ شجاع کے ساتھ خوش تھیں۔

ان خوشیوں کی عمر بڑی قلیل تھی۔ ایک شب جوان سال شجاع احمد دل کے دورے کو سہہ نہ سکے۔ سب پر قیامت ٹوٹی تھی۔ گھر والے کیا ساری دنیا کو افسوس تھا۔ زہرہ ان دنوں امید سے تھیں۔ جو رشک کر رہے تھے اب ان کا تاسف ختم نہیں ہوتا تھا۔

پہلے سب اسے بیٹے کی موت کا صدمہ اور بیٹے سے محبت سمجھتے رہے۔ سلطانہ بیگم زہرہ کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھیں۔ بیٹی کی ولادت کے بعد جب نانا جان نے انھیں اپنے ساتھ گھر لے جانا چاہا تو وہ اڑ گئیں۔ سب نے سمجھا بجھا کے انھیں منا لیا کہ کچھ دنوں کے لیے جانے دیں۔

کچھ دن بعد ہی وہ انھیں لینے آگئیں۔ نانی کے سمجھانے بجھانے کے بعد نانا جان نے ان دونوں کو ان کے ساتھ واپس جانے دیا۔

زہرہ کم عمر تھیں اور خوبصورت بھی۔ نانا جان صحیح وقت پر ان کے عقد ثانی کے خواہش مند تھے اور یہیں سے سلطانہ بیگم کی ضد اور ارادہ واضح ہوا۔ وہ زہرہ کی دوسری شادی کے خلاف تھیں۔ ان کا موقف تھا، ان کے بیٹے کی محبت، اب تاعمر ان کے بیٹے کی بیوہ بن کے رہے۔

نانا جان کے مالی حالات دیکھتے ہوئے انھیں کئی خیر خواہوں نے مشورہ بھی دیا کہ امیر گھرانہ ہے بیٹی اور نواسی کو رہنے دیں وہیں مگر نانا جان اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔ وہ زہرہ کے تمام عمر بیوگی کی زندگی گزارنے کے حق میں نہ تھے۔

شجاع احمد کے تینوں بھائی ان کی بات سمجھتے تھے۔ وہ بھی چاہتے تھے زہرہ اپنی مرضی اور پسند سے فیصلہ کریں مگر ماں کو سمجھانا ان کے اختیار میں نہ تھا۔ وہ خاندان کی ایسی سربراہ تھیں جس کا حکم اور رعب سبھی بیٹوں پر تھا۔ شوہر کی وفات کے بعد انھوں نے نہ صرف کاروبار سنبھالا تھا بلکہ بیٹوں کو بھی کم عمری سے ہی اس قابل بنایا تھا کہ وہ باپ کے قائم کیے کاروبار کو کمزور نہ ہونے دیں۔ وہ چھوٹا سا کاروبار سلطانہ بیگم کی وجہ سے ہی ڈوبنے سے بچ گیا تھا ورنہ کوئی اور خاتون ہوتی تو چار بچوں کے ساتھ اس مصیبت میں ہاتھ پیر چھوڑ دیتی۔ وہ اپنے حلقے اور خاندان میں مضبوط اور مشکل سے لڑنے والی عورت کے طور پر مشہور تھیں، جن کی سوجھ بوجھ، قربانی اور کڑے فیصلوں نے ان کے گھر کو سنوارا تھا۔

کسی طرح لڑ جھگڑ کے وہ زہرہ اور قدسیہ کو لے آئے اور جلد ان کے لیے رشتہ بھی مل گیا۔ فاروق کی پہلی بیوی، پہلے وضع حمل کے دوران بچی سمیت فوت ہوگئی تھی۔

اصل تماشہ اس وقت ہوا جب بی اماں نے عین نکاح کے وقت پہنچ کر خوب ہنگامہ کیا۔ سمجھنا مشکل تھا کہ اب وہ یہ سب بیٹے کی محبت میں کر رہی ہیں یا ضد میں۔ ان کے بیٹے کی محبت اور زہرہ کی بے وفائی جیسی باتیں فاروق کے گھر والوں کو پسند نہیں آئی تھی اور وہ کبھی بھولے بھی نہیں۔ زہرہ کے لیے جو ایک اچھا سسرال ثابت ہو سکتا تھا وہ پھر ویسا نہ رہا جیسی امید تھی۔ کئی دن تک گلی محلے میں باتیں ہوتی رہیں۔ شکر تھا کہ فارق سمجھدار تھے اور لوگوں کی باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ انھیں اپنی فوت ہوچکی اولاد کا دکھ تھا یا اس کے لیے دل میں چھپی محبت جو انھوں

نے ننھی قدسیہ کو اپنی اولاد کی طرح گلے لگا لیا تھا مگر قدسیہ کو کبھی اروی اور شاکر جیسا ددھیال نہ مل سکا۔ فاروق کے علاوہ اسے کسی نے قبول نہیں کیا تھا۔

سلطانہ بیگم نے اس کے بعد اپنے گھر والوں کے سمجھانے کے باوجود قدسیہ کو حاصل کرنے کے لیے مقدمہ کر دیا۔ پھر اس قسم کے مقدمات میں جو ماں کو غلط برا اور بدکردار ثابت کرنے کے لیے کیا جاتا ہے کہ بچی ماں کے پاس محفوظ نہیں، ان کے وکیل نے بھی وہ سب کیا۔ یہاں نانا جان نے ان کا اصل مقابلہ کیا اور قدسیہ زہرہ کے پاس ہی رہی۔ مگر وہ سب اس مسلسل جنگ اور ذہنی پریشانی سے تھک گئے تھے۔ بی اماں کے گھر والے بھی ان کے اس رویے سے پریشان تھے لیکن وہ ایسی دبنگ ماں تھیں کہ کسی کو مداخلت کی اجازت نہیں تھی۔

ماں کی طرف سے مایوس ہو کر یا خوف زدہ ہو کہ انھیں ان کی مرضی کرنے سے روکنا کسی کے اختیار میں نہ تھا، شجاع احمد نے نانا جان سے کہا کہ بہتر ہو گا فاروق اور زہرہ بلکہ وہ سب کسی ایسی جگہ چلے جائیں جہاں بی اماں ان تک پہنچ نہ سکے۔

سب اس قدر تھک گئے تھے کہ نانا جان سب کو لے کر اپنا سب کچھ بیچ کر اس چھوٹے سے شہر میں آ گئے۔ ماموں جان نے اس منتقلی کے لیے آج تک انھیں معاف نہیں کیا تھا۔

فاروق احمد نے اپنا تبادلہ قریب کے دوسرے شہر میں کروا لیا تھا۔ زندگی سکون سے گزرنے لگی تھی۔ زہرہ اور فاروق اپنے تینوں بچوں قدسیہ، شاکر اور اروی کے ساتھ خوش تھے۔ بی اماں کے رویے کے بعد زہرہ کو اپنے ابا کا فیصلہ بہت دانش مندانہ لگتا تھا۔ وہ جانتی تھیں یہاں وہ فاروق کی محدود آمدنی میں جتنی صابر شاکر اور مطمئن تھیں، وہاں کبھی نہیں ہو سکتی تھیں۔ چار سال پہلے چند مہینے کے وقفے سے فاروق اور زہرہ دونوں انھیں چھوڑ گئے تھے۔ نانی ان سے پہلے ہی فوت ہو چکی تھیں۔

☆☆☆☆

اس نے کبھی فقہ اور وراثت کے مسائل پر غور نہیں کیا تھا لیکن ان دو دنوں میں اس نے اتنا پڑھ لیا تھا کہ لگا اب وہ لوگوں کو مشورے بھی دے سکتی ہے۔

اس وقت بڑی دیر سے شہود کا کارڈ اور فون لیے کھڑی تھی۔ آخر اس نے اسی اسپتال کے کینٹین میں ملنے کا وقت لکھا اور نیچے اپنا نام لکھ کے بھیج دیا۔

ادھر سے فوراً جواب آ گیا تھا۔

”سی یو ڈیئر۔“

وہ جو دو دن سے محض سوچ رہا تھا اس وقت پکا فیصلہ کر لیا۔ اگر وہ ملنے آ رہی تھی تو یہ ہی ایک موقع تھا۔ وہ سب معلوم تو کر ہی چکا تھا تو یہ بھی جانتا تھا سرجری کے اخراجات کے لیے روپیوں کا انتظام اس سے نہیں ہو پائے گا اور بقول عراضہ یہاں اس کے اندر ’بی اماں‘ والے جینز جاگ گئے تھے۔

وہ اس سے پہلے پہنچ گیا تھا۔

وہ ادھر ہی نظر جمائے تھا جب وہ دروازے میں نمودار ہوئی۔ سیاہ اور سرمئی امتزاج والے کرتے پینٹ پر اس کا دوپٹا بہت بڑا تھا۔ سیاہ جوتے کی دو انچ کی ہیل کے باوجود وہ زیادہ لمبی نہیں تھی۔ بال لپیٹ کر آدھے ادھورے سے کیچر میں قید تھے۔ وہ شانے سے لٹک رہے پرس پر ہاتھ رکھے اسے تلاش کر رہی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ آگے بڑھی۔

وہ میز پر پہنچی تو وہاں کار کی چابی جو ننھا سا ریموٹ تھی اور اس کا فون رکھا تھا۔ آج اس کے بلیو چیک والی شرٹ کی آستینیں کہنیوں تک مڑی ہوئی تھیں۔ کسی نے سلام کیا نہ ہائے ہیلو۔

قدسیہ اپنا پرس میز پر رکھ کے بیٹھ گئی۔ وہ شاید پہلے ہی کہہ چکا تھا اس لیے اس کے بیٹھتے ہی بیرے نے کافی لا کر ان دونوں کے آگے رکھ دی۔

قدسیہ نے میز پر رکھی چھوٹی سی پانی کی بوتل اٹھائی مگر مجال ہے جو ڈھکن کھلا ہو۔

شہود نے ہاتھ آگے کیا۔ قدسیہ نے بوتل دے دی۔ اس نے ایک بار ڈھکن گھما کے بوتل اسے تھما دی۔ اب بھی قدسیہ نے شکریہ نہیں کہا۔ پانی پینے کے بعد اس نے بوتل واپس رکھی۔

چوں کہ یہ ملاقات اس نے طے کی تھی لہٰذا اصولاً اسے ہی بات کا آغاز کرنا تھا۔

اس نے ایک گہرا سانس لیا اور شہود کو دیکھا جو پوری توجہ اور دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ آج وہ اسے کوئی بڑا ساہوکار لگا۔

”دادا۔۔۔“ وہ شروع ہوئی۔

”آپ کے اور میرے۔۔۔ ان کی وفات میرے والد سے پہلے ہو گئی تھی یعنی وہ بھی ان کی جائداد کے وارثوں میں تھے اور ان کی وفات کے بعد ان کے حصے کی جائداد میں ان کی بیٹی اور بیوہ کا حصہ بھی تھا جو اتنے برسوں میں کئی گناہ بڑھ گیا ہو گا۔“ شہود کو اس کے الفاظ سے زیادہ اس کا اعتماد اور مضبوط، دوٹوک لہجہ متعجب کر رہا تھا۔ پہلے اسے حیرت نے گھیرا تھا کہ وہ دونوں ایک ہی نہج پر سوچ کر ایک سے فیصلے پر پہنچے تھے جن کی بنیاد پیسے اور ضرورت تھی مگر یہ دو متضاد فیصلے بھی تھے۔

”تو تمہیں وہ چاہیے؟“ وہ تم پر آیا اور قدسیہ نے غور ہی نہیں کیا کہ وہ جو کہہ رہی تھی وہ آسان نہیں تھا۔ بظاہر وہ بڑی پر اعتماد دکھائی دے رہی تھی مگر سارا رستہ وہ خود کو اروی کی باتیں یاد کر کر کے حوصلہ دیتی رہی تھی۔

”میرے چاہنے نہ چاہنے کی بات نہیں سچ یہ ہے وہ میرا اور امی کا تھا جو آپ سب نے آج تک دیا نہیں۔“ اس پر شہود کے استہزا اور طنز کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

”ویسے آپ کو ہمیں اس مقصد کے لیے ڈھونڈنا چاہیے تھا خیر۔۔۔“ اس نے جیسے خود کو پٹری سے اترنے سے روکا۔

”اگر آج نہ بھی مانگوں تو بھی وہ میرا ہی ہو گا لہٰذا مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔“

”او کے۔“ کسی کی نگاہ ایک دوسرے کے چہرے سے ہٹی نہیں تھی۔

”تو تم نے کیلکیولیشن بھی کر لیا ہو گا؟“ شہود نے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے پرس میں ہاتھ ڈال کر ایک پرچہ کھینچا۔

”اس ہاسپٹل میں اس سرجری کے جو بھی اخراجات ہو وہ مکمل پے کر دیجیے گا۔ باقی آپ سنبھالیں آئندہ جب ضرورت پڑی تو بتا دوں گی۔“

شہود کا دل کیا اس سنجیدہ صورت حال میں بھی اٹھ کر تالیاں بجائے۔

شہود نے پرچہ اٹھا کے دیکھے بنا جیب میں رکھا۔

”اور کچھ؟“

”کسی تیسرے کو اس بات کا علم نہ ہو۔“ قدسیہ نے اپنا پرس اٹھایا اور کافی کے دو گھونٹ لے کر کھڑی ہوئی۔

”ہاں۔۔۔“ وہ جانے لگی تھی کہ رکی۔

”یہ کافی میں نے اپنے ابا کے پیسوں کی سمجھ کے پی ہے۔“ اس کے بعد وہ رکی نہیں۔ بڑے سے دوپٹے کا سرا اٹھا کے شانے پر ڈالا اور پرس اٹھا کر چل دی۔

”واؤ جسٹ واؤ!“ شہود نے کافی کا کپ آگے کھسکا کے ہاتھ اٹھائے۔

وہ جو اسے یہ کہنے آیا تھا کہ تمھارے نانا جان کی سرجری میری ذمہ داری بشرط یہ کہ تم اپنی دادی سے مل لو، اب اس سے متاثر بیٹھا تھا۔ وہ اپنی بات نہ صرف کہہ گئی تھی بلکہ منوا گئی تھی اور دادی کا کہیں ذکر ہی نہیں تھا۔ یعنی اس کا مقصد پورا ہونا ہی تھا مگر شہود کے مقصد اب بھی وہیں تھا، نامکمل۔

اسے برا نہیں لگا تھا بلکہ وہ اس کے غیر متزلزل انداز، اعتماد پر حیران تھا۔ وہ، مسائل میں گھری تنہا، ضرورت مند لڑکی جو اس سے مرعوب ہوتی، اس مصیبت کے وقت مل جانے پر شکر گزار نظر آتی، ڈرتے جھجھکتے مدد کی گزارش کرتی۔۔۔ وہ ہر گز ایسی نہ تھی۔ وہ متاثر ضرور تھا مگر احمق نہیں تھا۔ اسے بھی اپنا مقصد حاصل کرنا تھا۔

باہر آتے ہی اس نے منہ پر ہاتھ پھیرا اور گہرے سانس لیے۔

”شاباش!“ اس نے خود کو سراہا۔

اپنی توقع سے اچھا ’پرفارم‘ کیا تھا اس نے۔ وہ ایسی نہیں تھی۔ صلاح جو طبیعت تھی اور اختلاف اور انتشار کا خدشہ ہو تو وہ خاموش رہنا پسند کرتی تھی مگر زندگی کے اس اہم موڑ پر جب دو سب سے اہم واقعے اور مسئلے اس کے سامنے تھے، اسے اپنے مزاج کا نیا رخ پتا چلا تھا۔

”اروی ٹھیک کہہ رہی تھی یہ موقع گنوانا بے وقوفی ہوتی۔ اللہ نے اسی وجہ سے تو اسے اس وقت مجھ سے ملوایا ہے ورنہ اتنے برس یونہی گزرے تو ہیں۔“ اس کی سوچیں ساری مثبت تھیں۔

”اب سب سے کہنا ہے کہ نانا جان کا آپریشن ہے۔“ وہ خوشی خوشی گھر جانے کے لیے بس اسٹاپ کی طرف جانے لگی۔

☆☆☆☆

”نانا جان اسپتال میں ہی ایک فلاحی ڈپارٹمنٹ ہے وہاں میں نے درخواست اور پیپرز جمع کیے ہیں جیسے ہی جواب آیا سرجری کی تاریخ فکس ہو جائے گی۔“

”یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔“ شاکر اور اروی بے انتہا خوش تھے۔ اس نے خالہ، ماموں کو فون کر کے یہ ہی بتایا تھا کہ اسپتال میں ہی ٹرسٹ ہے جہاں وہ ضرورت مند مریضوں کے اخراجات خود اٹھاتے ہیں۔

ایک دن بعد اسے شہود کا پیغام موصول ہوا اور وہ گھر میں اسپتال کا کہہ کر نکل گئی۔

اس نے اسپتال کے کیفے میں نہیں بلایا تھا بلکہ اسپتال کے قریب کی کافی شاپ آج جائے ملاقات بنی تھی۔

اس کے مطابق شہود نے اسے نقد رقم یا پھر چیک دینے بلایا تھا۔ آج وہ داخلی دروازے کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ جب اس کی ہیل کی آواز قریب ابھری تو اس نے فون سے سر اٹھایا اور اسے دیکھتے ہی فون رکھ دیا۔ آج بھی کسی نے سلام کیا نہ ہائے ہیلو۔

اس نے کرسی سنبھالی اور پرس میز پر رکھ دیا۔ آج چوں کہ شہود نے بلایا تھا لہٰذا وہ آگے آیا۔

”اسپتال میں جہاں بھی پے منٹ کرنی ہو گی اس سے ہو جائے گی۔“ اس نے کارڈ اس کے سامنے رکھا۔ قدسیہ نے کارڈ ہاتھ میں لیا اور الٹ پلٹ کے دیکھا۔ اس پر شہود کا ہی نام لکھا تھا۔

”بس۔۔۔ اسی لیے بلایا تھا؟“

”انہوں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

قدسیہ نے ابرو اونچے کر کے ”تو؟“ پوچھا۔

”اس کارڈ کا پن یہ ہے۔“ اس نے اپنے دائیں جانب رکھے لفافے پر ہاتھ رکھا۔ اس دن وہ اسے ساہوکار لگا تھا اور اس وقت کورین ڈراموں والا شاطر ’لون شارک‘! آج تو اس کا لباس بھی مکمل سیاہ تھا۔

”پہلے بی اماں سے مل لو تو یہ پن تمھارا۔“

قدسیہ نے کچھ کہا نہیں لیکن وہ سینے پر ہاتھ باندھ کے کرسی کی پشست سے ٹک گئی۔ شکل پر لکھا تھا۔

”یہ کیا بکواس ہے!“

”تمھارے نانا جان کی طرح مجھے بھی اپنی دادی اور ان کی خواہش، خوشی عزیز ہے۔“ شہود نے کہا۔

قدسیہ کچھ کہہ نہیں سکی مگر اندر ہی وہ اس موقع پرست اور بلیک میلر کو کوس رہی تھی۔

”مجبوری کا فائدہ نہ اٹھائے تو ان امیروں کے سینے پر ایک تمغہ لگنے سے رہ جاتا ہے۔ مروت شرم کی ان سے کیا توقع رکھنا۔۔۔ مجھے جذباتی ہونے کی بجائے عقل سے کام لینا ہو گا۔ اگر میں انکار کر دوں تو کیا؟ وہ مجھے پن نہیں دے گا مگر میں تو وہ مانگ رہی ہوں جو میرے باپ کا ہے، دینا تو اس کے باپ کو بھی پڑے گا۔۔۔ مگر کیوں بات بڑھا کے اسے پیچیدہ کروں۔۔۔ نانا جان کی سرجری میں دیر ہو گی اس کا تو کچھ نہیں جائے گا۔۔۔ اروٰی کی طرح سوچنا ہو گا۔۔۔“

سوچتے ہوئے اس نے سامنے رکھی بوتل اٹھائی۔ کیفے بدلے مگر بوتل اس بار بھی اس سے نہ کھلی۔ شہود نے اس سے بوتل مانگنے کی بجائے دوسری بوتل اٹھا کے کھولی اور اس کے سامنے رکھ دی۔ قدسیہ نے اپنی بوتل رکھ کے کھلی اٹھالی۔

جب وہ گھر میں کہہ آئی تھی کہ اسپتال جا رہی ہے تو اسے واپس جا کر سرجری کی تاریخ بتانا تھی اور اب۔۔۔

”چلیں۔“ وہ پانی پی کر ایک دم کھڑی ہو گئی۔ اتنی دیر میں اس نے فیصلہ کر لیا۔

شہود کو یقین نہیں آیا۔ وہ لفافہ جیب میں رکھ کے اٹھ گیا۔ قدسیہ نے ایسے منٹوں میں پہلی بار کوئی فیصلہ کیا تھا اور اسے نہیں معلوم تھا وہ کیا کرے گی۔ اسے بس یہ علم تھا ڈاکٹر سے بات کر کے اسے سرجری کی تاریخ اور وقت طے کرنا ہے۔ جب شہود پارکنگ کی طرف جا رہا تھا، وہ رک گئی۔

”میں ایک ضروری کال کر لوں۔“ شہود نے مڑ کے دیکھا اور کچھ کہے بنا آگے چلا گیا۔

اس نے ڈاکٹر کو فون کر کے بتایا کہ پیسوں کا انتظام ہو گیا ہے وہ جب کہیں گے وہ نانا جان کو اسپتال میں داخل کروا لیں گی۔

فون رکھا ہی تھا کہ کار قریب آ کے رکی۔

اس نے پوچھا بھی نہیں تھا کہاں جانا ہے، کتنی دور ہے۔ وہ اندر بیٹھ گئی۔ شہود نے کار آگے بڑھالی۔

دونوں خاموش تھے۔

”آپ کے یہاں سب کو علم ہے میں آ رہی ہوں؟“

”نہیں۔“ یہ جواب متوقع نہیں تھا۔

”انھیں کیا ہوا ہے؟“ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

"ہارٹ پیشنٹ ہیں اور کئی سارے کامپلیکیشنز ہیں۔"

وہ سوچنا بھی چاہ رہی تھی تو اس وقت دادی کے لیے کوئی جذبہ نہیں جاگ رہا تھا نہ غصہ نہ ہمدردی۔ وہ چل تو پڑی تھی مگر بالکل نہیں جانتی تھی کہ کیا کرے گی۔ اسے ایک دم خالہ کا خیال آیا۔ کوئی ہو تا نہ ہو تا انھوں نے ضرور ناراض ہونا تھا۔ انھیں دنیا میں ایک ہی انسان سے نفرت تھی اور وہ تھی بی اماں! وہ کہتے ہوئے بھی اکثر رو پڑتی تھیں کہ ان کی وجہ سے سارے خاندان نے کتنا سہا اور کس قدر سنا تھا۔ اگر فاروق کو اللہ نے نیکی کی ہدایت نہ دی ہوتی تو اس کی دادی کی حرکت نے زہرہ کی زندگی جہنم بنادی تھی۔

"مجھے پتا ہے۔۔۔" اچانک شہود کہنے لگا۔

"انھوں نے جو کیا وہ غلط تھا لیکن ہم دنیا کے سارے غلط کرنے والوں سے نفرت نہیں کر سکتے۔۔۔ یہ میں اپنے متعلق کہہ رہا ہوں۔۔۔" اس نے گردن گھما کے اسے دیکھا۔

"تمھیں تو سارے اختیار ہیں نفرت کرنے کے۔۔۔ بس خیال رہے کہ اب وہ اس اسٹیج پر ہے کہ ہم انھیں ان کی غلطیاں یاد دلا کے شرمندہ نہیں کر سکتے۔"

"کیوں نہیں کر سکتے؟" اس نے تڑخ کے پوچھا۔

شہود نے اسے یوں دیکھا کہ وہ جھٹ کہہ اٹھی۔

"تو آپ کو مجھے پہلے ڈھونڈنا چاہیے تھا اب کیا فائدہ۔" اس نے پرس کو سختی سے دبوچا۔

"جب میں اپنے دل کی سنا نہیں سکتی تو ان سے ملنے کا کیا مطلب!" شہود چپ رہا۔

گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ جلد ہی وہ اس عالیشان بنگلے کے قریب پہنچ گئے۔

اس نے ذہین میں اگلے کچھ منٹ ترتیب دیے۔ سیدھا دادی کے کمرے میں جائے گی سلام کرے گی، چند منٹ بیٹھ کر ان کی بات سنے گی، اپنا منہ بند رکھے گی اور پن والا لفافہ لے کر واپس گھر۔

وہ دونوں ایک ساتھ اپنی اپنی جانب کا دروازہ کھول کے باہر نکلے۔ لان خاصا بڑا تھا اور خوبصورت بھی۔

وہ اس کے پیچھے پیچھے پورچ میں آئی اور وہاں سے ڈرائنگ روم میں۔ صحن سمت اس کے گھر سے بڑا تو صرف ڈرائنگ روم تھا۔ کہیں خیال کلبلایا کہ تمھاری دادی تمھیں یہیں رکھنا چاہتی تھیں اس لان، اس ڈرائنگ روم میں، اور اس نے خود کو ڈپٹا کہ شرم کرو پہلے قدم پر ہی مادیت پسندی پر اتر آئی!

"بیٹھو۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور خود اندر بڑھا۔ وہ بیٹھی نہیں۔

"مما! مما!" وہ وہیں سے آواز دیتا اندر غائب ہو گیا۔

”کدھر ہوگا ان کا روم؟“ اسے کسی اور سے مطلب نہیں تھا۔

چاروں طرف نظر ڈالنے کے بعد اس نے اوپر دیکھا۔

”مریض کو اوپر تو نہیں رکھیں گے۔ ادھر ہی کہیں ہوگی۔“ اس نے چاروں طرف دیکھا۔

”پتا نہیں کتنے لوگ ہیں۔“ خالہ نے ہی اسے یاد کروایا تھا کہ اس کے ابو کے تین بھائی تھے۔ ان کا مقام تیسرا تھا۔

ذرا دیر بعد شہود، سعیدہ کے ساتھ واپس آیا۔ ان کے چہرے پر خوشی اور اشتیاق تھا۔

”ماشاء اللہ! تم تو ہو بہو زہرہ کی کاپی ہو۔“ انھوں نے قریب آ کے کہا۔ ذرا رکیں، جھجھکیں اور پھر اسے گلے لگالیا۔ وہ اس کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ نہ ان جیسی گرم جوشی دکھا پائی نہ ہی مروت۔

سعیدہ اس سے دور ہوئیں تو ان کی آنکھیں بھیگی تھیں۔ اور یکایک اسے یاد آیا کہ نانا ان ہی کی بات کر رہے تھے جو اس کی امی کی اچھی سہیلی تھیں۔

”میں تو یہ ہی سمجھتی رہی وہ اپنے گھر میں شاد و آباد ہے۔ یہ تو اب پتا چلا وہ کب کی جا چکی، بیٹھو۔“ کہتے ہوئے وہ خود بھی بیٹھ گئیں۔ قدسیہ بھی ٹک گئی۔

”اور کتنے بہن بھائی ہیں؟“

”ایک بھائی اور بہن۔“

”انکل آنٹی۔۔۔ تمھارے نانا نانی کیسے ہیں؟“

”نانی تو کب کی وفات پا چکیں۔ نانا جان الحمد اللہ حیات ہیں۔“

شہود کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اسے کم سے کم قدسیہ کے تعلق سے اہم اور ضروری باتیں انھیں بتا دینی چاہیے تھیں۔

”پہلے بی اماں سے مل لیں۔۔۔ آپ پھر باتیں کیجیے گا۔“ اس نے سعیدہ کو مخاطب کیا۔

”ہاں ہاں آؤ۔“ وہ کھڑی ہوئیں۔

”تم ذرا باقیوں کو اطلاع دو، قدسیہ کو بی اماں کے پاس میں لے جاتی ہوں۔ تم بھی وہیں آنا۔“ بیٹے سے کہہ کر انھوں نے اسے ساتھ آنے کو کہا۔

”آؤ۔“ وہ شہود پر ایک نظر ڈال کے ان کے پیچھے ہولی، جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

ڈرائنگ روم سے لگا پہلا کمرہ ہی ان کا تھا۔ سعیدہ نے دستک دے کر دروازہ کھولا۔

”سو رہی ہیں؟“ اندر داخل ہوتے ہوئے انھوں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ انھوں نے چشمہ اور اخبار ایک طرف رکھا۔

”دیکھیں شہود کسے لایا ہے۔۔۔“ انھوں نے مڑ کے اسے دیکھا جو دروازے میں ہی رک گئی تھی۔ انھوں ہاتھ بڑھا کے اسے اندر آنے کہا اور وہ جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

”شجاع کی بیٹی، قدسیہ آپ سے ملنے آئی ہے۔“ اسے اس جملے سے اختلاف تھا وہ ملنے آئی نہیں تھی بلیک میل کے ذریعے لائی گئی تھی۔

”السلام علیکم۔“ اسے اپنے والدین اور نانا نانی کی تربیت ثابت کرنی تھی سو اپنے جذبات پر پردہ ڈالا۔

وہ بڑے سے پلنگ پر سرخ سفید رنگت اور سفید بالوں والی فربہ بزرگ کی امید نہیں کر رہی تھی جن کی صورت پر نرمی اور شفقت بھی تھی۔ وہ تو کوئی سانولی، مہندی لگے بالوں والی، کھرانٹ، سخت، دبلی، تیز طرار قسم کی بوڑھی کی توقع کر رہی تھی، جس کے چہرے سے مکاری اور غرور چھلکتا ہو۔ خالہ کی باتوں نے اس کے ذہن میں یہ ہی خاکہ بنایا تھا۔

”وعلیکم السلام۔“ ان کی آواز میں لرزش تھی اور جواب دینے سے پہلے ان کے آنسو جاری ہو گئے تھے۔

”یہاں آؤ۔“ اتنے جذباتی منظر میں بھی ان کا لہجہ حکمیہ سا تھا، جس میں نرمی تھی کہ وقت سب کو بدل دیتا ہے۔

”جاؤ۔“ سعیدہ نے اس نے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ جھجکتے ہوئے آگے بڑھی۔ پلنگ کے قریب پہنچی ہی تھی کہ انھوں نے اپنے بازوں وا کیے۔ دل تو کیا کہہ دیں۔ وہ اس لگاوٹ کے لیے تیار نہیں مگر وہ خود بخود ان کے گلے جا لگی۔ وہ اسے سختی سے خود میں سمیٹے رونے لگی تھیں۔ ان کے بیٹے کے وجود کا حصہ ان کی بانہوں میں تھا۔

شہود اندر آیا تو بی اماں رو رہی تھیں۔ سعیدہ اپنی آنکھیں بار بار خشک کر رہی تھیں اور قدسیہ جھکی ان کے گلے لگی تھی۔

”آپ نے وعدہ کیا تھا کہ طبیعت خراب نہیں ہونے دیں گی۔“ وہ پلنگ کے دوسری طرف جا کے کھڑا ہو گیا۔ قدسیہ نے خود کو ان سے دور کیا۔

”تم نے مرنے سے پہلے میری خواہش پوری کر دی۔“ انھوں نے شہود کے ہاتھ تھام لیے۔

”جیتے رہو۔“ انھوں نے اس کے ہاتھ چومے پھر اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”آؤ یہاں بیٹھو۔“ انھوں نے ہاتھ اپنے قریب رکھا اور خود ایک طرف کھسکنے کی ناکام کوشش کی۔

وہ کنارے ٹک گئی۔

”کتنی باتیں ہیں، کیا پوچھوں پہلے؟“ انھوں نے نم سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔ اس کا دل کیا کھڑی ہو جائے اور اس کے پاس جتنے سوال ہیں وہ سب ابھی اور اسی وقت ان سے پوچھ ڈالیں۔ لیکن آج بدن سوچوں کا تابع نہیں رہا تھا۔ وہ برف کے تودے کی طرح سرد سی بیٹھی رہی۔

”کیا پڑھ رہی ہو؟ کالج جاتی ہو؟“

”نہیں۔“

”اچھا آفس سے آئی ہو؟“

”میں جاب نہیں کرتی۔“

”گھر میں سب کیسے ہیں؟“

”اچھے ہیں۔“

”تمھاری ماں۔۔۔ زہرہ۔۔۔ زہرہ کیسی ہیں؟“ اس نے چند پل انھیں دیکھا۔ وہ باری باری سب کا پوچھیں اس سے پہلے ایک بار ہی انھیں بتا دینا بہتر۔

”امی، ابا، نانی جان تینوں کا انتقال ہو گیا ہے۔ نانی جان کو کافی سال ہو گئے ہیں، امی ابا کو چار ساڑھے سال۔“

ان کے چہرے پر بے یقینی اور دکھ پھیل گیا۔

”بی اماں!“ شہود کو غلطی کا احساس ہوا اسے انھیں کچھ باتیں پہلے بتا دینا چاہیے تھیں۔ ایک ساتھ کئی انکشاف اور قدسیہ سے ملاقات ان کے لیے ٹھیک نہیں تھی۔

”آپ سب آج ہی نہ پوچھ لیں۔ یہ اب مل گئی ہیں۔“ قدسیہ نے غصے سے اسے دیکھا۔ اس کا دوبارہ آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

”ہاں بی اماں آپ طبیعت بھی سنبھالیں۔“ سعیدہ بھی قریب آئیں۔

”اس کے لیے کچھ لاؤ، کیا کھاؤ گی بیٹا تم؟ کیا پسند ہے تمھیں؟“

قدسیہ نے طنزیہ مسکراہٹ کو بمشکل روکا۔ اسے یہ محبت اور پروا مصنوعی، مطلبی لگ رہی تھی۔

”کچھ نہیں۔۔۔ میں اب چلوں گی۔ گھر میں کسی کو بتایا بھی نہیں ہے میں نے۔“ وہ کھڑی ہوئی اور شہود کو دیکھا۔

”کچھ دیر ٹھہرو بیٹا، چائے تو لو۔“ سعیدہ نے اس کا ہاتھ تھام کے اسے صوفے پر بٹھایا۔

”میں ابھی آئی۔“ وہ باہر چلی گئیں۔

”کیا ہوا تھا زہرہ کو؟“ ان کی آواز اب پہلے سے نحیف تھی۔

”اسٹروک۔ وہ بے ہوش ہو کر گریں تو پھر ہوش میں نہیں آئیں۔“

”تمھارے نانا کیسے ہیں؟“ کچھ وقفے تک بڑی بوجھل سی خاموشی کے بعد انھوں نے پوچھا۔ قدسیہ کی نظر بے ساختہ ہی اس کی جانب اٹھی جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”وہ ٹھیک ہیں۔ چند دنوں میں ان کی برین سرجری ہے۔“ دوسرا جملہ بے ارادہ ہی غصے میں شہود کو جتانے کے لیے نکلا تھا۔

”اوہ میرے مالک!“ انھوں نے ایک گہرا سانس لے کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ان کی کیفیت بدل رہی تھی۔ شہود نے کوئی بٹن دبایا، دور سے بزر جیسی آواز آئی اور اگلے پل ہی یونیفارم پہنے نرس دروازے سے اندر آئی۔

”آپ باہر جائیں۔“ نرس نے شہود سے کہا اور نیم بے ہوش سی بی اماں کی طرف بڑھیں۔

وہ شہود کے قریب آنے سے پہلے ہی گھبرا کے کھڑی ہو گئی تھی۔

”آؤ۔“ وہ اسے پہلے چلنے کا اشارہ کرتا رک گیا۔

قدسیہ نے ایک نظر پلنگ پر ڈالی جہاں نرس ان کے بازو میں آلے کا بیلٹ لگائے فشارالدم جانچ رہی تھی۔

وہ آگے اور اس کے پیچھے شہود باہر نکلا۔

”انھیں کیا ہوا ہے؟“

”کبھی بی پی لو ہوتا ہے یا کبھی ہارٹ ریٹ سلو ہو جاتا تھا۔۔۔ کوئی ایک پروبلم نہیں ہے۔“ وہ حد درجہ سنجیدہ تھا۔

وہ پھر ڈرائنگ روم میں تھے۔

”میں جاؤں گی اب، آپ آنٹی سے چائے کا منع کر دیں۔“ شہود نے ذرا ناگواری سے اسے دیکھا۔

دادی کا یہ حال دیکھنے کے بعد بھی اسے بس اپنی پڑی تھی۔

اسی وقت سعیدہ اندر آئیں۔ ان کے پیچھے ٹرالی لیے ملازمہ تھی اور اس کے پیچھے نیلوفر اور فرزانہ۔

”گھبراؤ نہیں۔ بی اماں ٹھیک ہیں بس زیادہ جذباتی ہو جائیں تو ایسا ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔“ انھوں نے قدسیہ کو تسلی دی جسے کوئی فکر نہ ہونے کے احساس پر بیٹا خفا کھڑا تھا۔

”بیٹھو۔ یہ تمھاری نیلوفر تائی ہے اور یہ فرزانہ چاچی۔“ انھوں نے باری باری تعارف کروایا۔ ان کے رویوں سے اسے اندازہ ہوا کہ بی اماں کی طبیعت کے یہ اتار چڑھاؤ ان کے لیے نئے نہیں بلکہ معمول ہیں۔

وہ تینوں ساتھ والے صوفے پر بیٹھیں تو اسے بھی بیٹھنا پڑا۔ ملازمہ نے چائے کا کپ اسے دیا اور کوئی پلیٹ اٹھا رہی تھی کہ اس نے منع کر دیا۔

سعیدہ نے کچھ بتا دیا تھا پھر بھی وہ دونوں اس سے اسی سے ملتے جلتے سوال کرتی رہیں۔

”رکو تھوڑی دیر بچے آجائیں گے سب سے مل کر جانا۔“ وہ اجازت لے کر کھڑی ہوئی تو نیلوفر نے کہا۔

”میں گھر پر بتا کر نہیں آئی ہوں۔“

”تو۔۔۔ کیا یہ تمھیں راستے میں کہیں ملی؟“ فرزانہ نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ اس شہر میں نہیں رہتے ہیں اتفاق سے آج ادھر آئیں تو ملاقات ہوگئی ورنہ میں پہلے سے اطلاع دے کر ملواتا۔“ شہود ان کے سوال کو بخوبی سمجھ رہا تھا اسی لحاظ سے انھیں جواب دیا۔

وہ داخلی دروازے کی جانب بڑھ گئی تھی۔ اس کے پیچھے شہود اور سعیدہ تھے۔

”تمھارے لیے یہ سب کچھ ایزی نہیں ہوگا۔۔۔“ زینے اترنے سے قبل اس نے مڑ کر انھیں دیکھا تو سعیدہ نے کہا۔

”تم پھر بھی آئی، بہت شکریہ۔ اپنے نانا جان سے سلام کہنا۔ میں آؤں گی جلد ان سے ملنے۔“

اتنے افراد میں اسے بس یہ خاتون اچھی لگی تھیں۔

”شہود تمھیں گھر ڈراپ کردے گا۔ آتی رہنا بیٹا۔“ انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

وہ اللہ حافظ کہہ کر زینے اتر گئی۔ شہود کار گیٹ کے پاس روکے کھڑا تھا۔ وہ اندر بیٹھی اور کار آگے بڑھ گئی۔

”مجھے بس اسٹاپ تک چھوڑ دیں۔“ شہود چپ رہا۔

کچھ دیر بعد جب اسے راستے کا احساس ہوا تو دماغ گھوم گیا۔ وہ اس کا مالک تھا، سرپرست تھا نہ دوست جو اس کی بات نظر انداز کرنے کا حق رکھتا۔ یوں زبردستی کی دھونس جمانے والے اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ وہ پھٹ پڑتی اس سے قبل ہی دماغ نے سمجھایا کہ مقابل شاید اس کے رد عمل سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہی یہ کر رہا ہے اور اس نے خود کو بڑے ضبط سے روک لیا۔

”آپ مجھے وہ انویلپ دیں اور کار سائیڈ میں روکیں۔“ جب غصے پر مکمل قابو پالیا تو اس نے عام لہجے میں کہا۔

”میں تمھیں گھر ڈراپ کر رہا ہوں۔“ اس نے بھی اتنے ہی عام لہجے میں جواب دیا۔ اب بحث کیسے نہ ہو۔۔۔!

”اچانک ایک دن اجنبیوں کی زندگی میں آکر رشتے دار جیسا ’ایکٹ‘ کرنا آپ کے لیے ممکن ہو میرے لیے نہیں، میں خود گھر چلی جاؤں گی۔“

”جس طرح اب تک خاموش تھیں ویسے ہی سارا راستہ رہو تو تمھارے لیے بھی رشتے دار جیسا ایکٹ کرنا ممکن ہوگا۔۔۔ اٹس ویری ایزی۔“

اس کی نظر راستے سے اِدھر اُدھر نہیں ہو رہی تھی اور قدسیہ کی اس کی شکل سے ہٹ نہیں رہی تھی۔

”آپ یہ غلط فہمی دور کرلیں کہ آپ مجھ پر کوئی احسان کر رہے ہیں اس لیے میں سب کچھ سنتی اور مانتی جاؤں گی۔ پن والا بلیک میل مان لینا میری مجبوری نہیں تھی بلکہ میں خوامخواہ بات بڑھانا اور الجھانا نہیں چاہتی تھی، آپ اسے میری کمزوری سمجھنے کی بھول نہ کریں۔“

”تو اب کیوں بات بڑھا اور الجھا رہی ہیں؟ گھر ہی جانا ہے، وہیں ڈراپ کروں گا اور یہ بھی کوئی احسان نہیں ہوگا۔ میں بھی اپنی مما کی بات مان رہا ہوں۔“ اس پر اس کے غصے کا کوئی اثر نہیں تھا۔

تیز اور چبھتی نظروں سے اسے بڑی دیر تک گھورنے کے بعد وہ سامنے دیکھنے لگی کہ شہود پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

باقی راستہ خاموشی سے طے ہوا۔

وہ چونکی اس وقت جب کار گھر کی بجائے کہیں اور رکی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا اور وہ 'اے ٹی ایم' کے سامنے تھے۔ اس نے الجھ کے اسے دیکھا۔

"کارڈ لے لو۔"

بیلٹ نکال کر باہر نکلنے سے پہلے اس نے قدسیہ سے کہا۔ اس کے پیچھے وہ پرس لیے برداشتہ خاطر سی باہر آئی۔

وہ اسے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے 'اے ٹی ایم' کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ اس کی بےزاری پھر غصے میں ڈھلنے لگی۔

"مذاق سمجھ رکھا ہے!" وہ تپی سی اندر کے سرد ماحول میں داخل ہوئی۔

"پن جنریٹ کر لیں، او ٹی پی کے لیے میرا فون ضروری ہے۔" وہ ایک طرف کھڑا اسے مشین کے سامنے جانے کی جگہ دے رہا تھا۔

قدسیہ کو سمجھتے ہی اپنے بے وقوف بن جانے کا خیال مزید غضب ناک کر گیا۔ اس نے پرس سے کارڈ نکالا اور مشین کے سلاٹ میں ڈالا۔ اسکرین پر نظر آ رہی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اس نے 'جنریٹ پن یوزنگ او ٹی پی' منتخب کیا۔ چند لمحے بعد شہود کے فون میں اشارہ گونجا، اس نے چار عدد بلند آواز میں پڑھے اور اس نے ٹائپ کیے جس کے بعد اسے اپنی مرضی کا پن لکھنا تھا۔ ذہن میں کوئی خاص تاریخ آئی نہ دن۔ کچھ دیر ہاتھ روک کے اس نے آج کی تاریخ اور مہینہ اعداد میں لکھ دیا۔ اس کے بعد پن کی تصدیق کی اور کارڈ سلاٹ سے نکالا۔

شہود اس سے پہلے باہر چلا گیا اور وہ اپنی جھنجھلاہٹ پر قابو پاتی ذرا دیر بعد باہر آئی۔ وہ کار کے اندر بیٹھتے ہی کہنا چاہتی تھی کہ اس جھوٹ کی کیا ضرورت تھی میں یونہی مل لیتی ان سے، مگر نہیں کہا کیوں کہ فوراً احساس ہوا تھا کہ یہ 'بلیچ والا' سفید جھوٹ ہوتا۔

گھر کے آگے کار رکی۔ اس نے سوچا تھا کہ سختی سے اسے جتا دے گی کہ آئندہ وہ کسی حال میں اس کے گھر نہیں جائے گی، مگر اس وقت اس کا اسے دیکھنے اور مخاطب کرنے کا دل نہیں کیا۔ اس نے دروازہ کھولا اسے اندر بلانا تو دور وہ شکریہ کہے بنا اتر گئی۔ شہود اپنی جانب کا دروازہ کھول کے باہر آیا۔

"مجھے اپنے نانا جان سے ہی ملوا دو۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"کیوں؟" وہ بل کھا کے پلٹی۔

"رشتے دار ہیں میرے۔"

"یہاں صرف میں کچھ لگتی ہوں آپ کی اور مجھے بھی مزید آپ سے ملنے میں دلچسپی نہیں ہے۔" اسے بری طرح احساس ہو رہا تھا وہ اپنی خوشی اور مرضی کے بنا اس کے ہاتھ کھلونا بن گئی تھی۔ اس نے جیسا چاہا ویسا اس سے کروا لیا تھا۔ اسے اس وقت خود پر غصہ تھا اور وہ نکل شہود پر رہا تھا۔

”تمھیں نہ ہو لیکن گھر کے باقی افراد کو تو ہو سکتی ہے۔“ قدسیہ کو لگا وہ مسلسل اس سارے فساد میں اسے غیر اہم ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے یعنی وہ جب چاہے اسے اپنے گھر لے جائے گا، جب چاہے اس کے گھر آئے گا۔ اس کے چاہنے نہ چاہنے یا غصہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے اور ایسا کیوں تھا۔۔۔؟ کیونکہ وہ روپیوں کے لیے اس کی محتاج ہے۔۔۔ اسے اس وقت کارڈ اس کے منہ پر مارنے کے بعد دروازہ بھی دھاڑ سے بند کرنا چاہیے تھا۔۔۔ تو کیا وہ اسی انتظار میں ہے کہ میں یہ دونوں کام کر گزروں؟

وہ اپنے ازلی اعتماد سے چلتی اس کے سامنے آ کر رکی۔

”ضرور ہو گی کہ ہم سب مہمان نواز ہیں اور یہ غلط فہمی دور کر لیں کہ میں پِن کی وجہ سے آپ کے ساتھ چل پڑی تھی وہ میری تربیت کا حصہ ہے کہ نانا جان کی بات میں ٹال نہیں سکتی۔۔۔ وہی نانا جو بیگم سلطانہ کے ہاتھوں اتنا کچھ سہنے کے بعد بھی مجھے ان سے ملنے کہہ رہے تھے کہ آخری وقت میں بزرگوں کے ساتھ اختیار اور قوت ہونے کے باوجود درگزر سے کام لینا چاہیے کہ یہ مظلوم کا امتحان بھی ہو سکتا ہے اور یاد رکھیں میں پیسوں کے لیے مجبور نہیں بلکہ بہت اسٹرونگ اور سکیور ہوں کہ اب مجھے پتا ہے اپنے بلز کس پتے پر بھیجنے ہیں۔“ چند ثانیے اسے دیکھنے کے بعد وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اندر جا کے اس نے قصداً دروازہ دھیرے سے بند کیا۔ وہ اسے یہ دکھا کے خوش نہیں کرنا چاہتی کہ اس کے اندر کس قدر شدید طوفان اٹھا ہے۔

شہود کچھ دیر دروازے کو دیکھتا رہا۔ وہ واقعی اندر جانا چاہتا تھا مگر پھر خاموشی سے کار کی طرف مڑ گیا۔

”بہت دیر کر دی بیٹا۔“ وہ باورچی خانے سے پانی پی کر خود کو ٹھنڈا کر کے سیدھی نانا جان کے پاس آئی۔

”جی نانا جان۔“ وہ ان کے قریب بیٹھ گئی۔

”میرا اپلیکشن اور ریکوئسٹ اپروو ہو گئی ہے جلد ہاسپٹل والے سرجری کی ڈیٹ بتائیں گے۔“

”اچھا۔“

”راستے میں مجھے وہ بھی مل گئے تھے۔۔۔ شہود شفیع احمد اور مجھے آپ کی بات یاد آئی تو میں نے سوچا اب آ ہی گئی ہوں تو ان سے مل لوں پھر سرجری کی وجہ سے وقت نہیں ملے گا۔“

”بہت اچھا کیا۔“ انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”اللہ تمھیں اس کا بہترین اجر دے گا ان شاء اللہ۔“ وہ کچھ بول نہ سکی۔ کچھ دیر بعد یاد آیا تو گویا ہوئی۔

”وہ۔۔۔ سعیدہ آنٹی۔۔۔ انھوں نے سلام کہا ہے۔ آپ کا، سب کا پوچھ رہی تھیں۔ کہا ہے ملنے آئیں گی۔“

”وعلیکم السلام۔ سعیدہ نیک فطرت خاتون ہیں۔ ایک تمھاری دادی کا مزاج ہی مختلف تھا ورنہ شجاع کے بھائی بہت سمجھدار تھے لیکن ضدی ماں کے آگے نہ کچھ کہہ سکتے تھے نہ کر سکتے تھے پھر بھی شفیع نے کافی مدد کی تھی۔“

”ارے تم کب آئی؟“ اروی اندر آئی۔

”ابھی، کچھ منٹ پہلے۔ شاکر کہاں ہے؟“

”ذرا دیر پہلے باہر گیا ہے۔“

پھر اس نے اروی کے استفسار پر اسے بھی وہی کہانی سنائی جو نانا جان سے کہی تھی البتہ اروی کے جواب نانا جان جیسے نہ تھے۔ اسے اس گھر، اس خاندان اور دادی سے ملاقات کی ساری تفصیل چاہیے تھی۔

☆☆☆☆

خالہ سے یہ بات چھپ نہیں سکتی تھی۔ وہ فوراً رکشا کر کے گھر پہنچیں۔

”تم سے یہ امید نہیں تھی۔ کیسے بھول گئی تم اپنی ماں کا دکھ اس کے ساتھ جو اس عورت نے کیا تھا، کیا کچھ نہیں چھین لیا اور آج تک پلٹ کے نہ دیکھا پوتی کو۔۔۔ چلو مان لیا ہم ان سے چھپ گئے لیکن کیس ہارنے کے بعد ایک بار ملتی تو آ کے، تمھارا خرچا ہی اٹھا لیتی۔ اس جیسی ناگن عورت سے ملنے گئی تم۔۔۔؟ صرف اس کی خود غرضی اور ضد کی وجہ سے تمھیں فاروق بھائی کی فیملی نے اروی شاکر جیسا پیار نہیں دیا، آپا سے خفا اور شاکی رہے۔“ ان کی بے یقینی، افسوس اور غصہ کسی صورت کم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ پچھلے گھنٹہ بھر سے وہی سب باتیں گھما پھرا کے کئی بار کہہ چکی تھیں مگر تھکی نہیں تھیں۔

”اب قبر میں پیر لٹکے ہیں تو پوتی یاد آ گئی اور بے وقوف پوتی دوڑ کے مل بھی آئی۔“ انھوں نے تاسف سے سر ہلایا۔

”جیسے کو تیسا سنا نہیں تم نے؟ یہ ان کے کیے کا پھل کاٹنے کا وقت ہے۔ قدرت نے انتظام کیا ہے یہ کہ اب تڑپنے دیا جائے اسے جس نے دوسرے معصوموں کی زندگی اجیرن کی تھی۔ مجھے تو ان کے گھر والوں پر حیرت ہے انھیں بھی کوئی شرم نہیں۔۔۔ قسم سے کہہ رہی ہوں تم نے اپنی ماں کو دیکھا ہوتا نا تو کبھی نہیں کرتی ایسا۔“ وہ روہانسی ہو گئیں۔

”انھوں نے صرف آپا کو نہیں ستایا۔ ہمارا سارا گھر برباد ہوا ان کی وجہ سے۔ بھائی ابا سے آج تک ناراض ہیں کہ وہ شہر چھوڑ کے سب سمیٹ کر یہاں آ گئے، میری سسرال والے آج تک طعنہ دیتے ہیں کہ ابا نے جہیز نہیں دیا کیونکہ یہاں سے وہاں آنے جانے میں ان کے پاس کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ میں نے ساری عمر اس وجہ سے سر جھکایا ہے کہ اکلوتی بہو ہوں جو خالی ہاتھ آئی تھی۔۔۔ تم اتنا سب بھول کے کیسے ان سے میل ملاپ کو چلی گئی۔۔۔؟“

”خالہ!“ اس نے انھیں شانوں سے تھام کے بٹھایا۔

”نانا جان چاہتے تھے میں مل لوں۔“

”ابا بھی نا!“ یہ ہی ایک بات انھیں کچھ شانت کر سکتی تھی۔

ارویٰ نے انھیں چائے کا کپ تھمایا۔ قدسیہ نے انھیں پانی کا گلاس دیا جو وہ کب سے لیے کھڑی تھی۔ انھوں نے پہلے پانی پیا پھر چائے پینے لگیں۔

”ویسے کیسی ہے وہ؟“ ان کی آواز میں حقارت تھی۔

”بیمار ہیں۔۔۔“ اسے بڑا سنبھل کے بولنا تھا اور وہ وہی کر رہی تھی ورنہ انھیں پھر مشتعل ہونے میں دیر نہیں لگنی تھی۔

☆☆☆☆

جس دن سرجری تھی اس سے ایک دن پہلے نانا جان کو اسپتال میں داخل ہونا تھا۔ وہ تینوں ان کے ساتھ اسپتال گئے تھے۔ کچھ ضروری تفتیشی جانچ ہونی تھیں۔ رات اس نے رکنا چاہا مگر شاکر نے شام سے ہی ان دونوں کو گھر بھیج دیا۔

ساری رات نیند نہیں آئی اور اگلے دن وہ دونوں صبح کی پہلی بس سے ہی اسپتال پہنچ گئیں۔ خالہ کو انھوں نے منع کر دیا تھا کہ ان کے لیے دن بھر گھر سے دور رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ فون پر پل پل کی خبر لے رہی تھیں۔ شاکر نے ماموں جان کو بھی فون کر دیا تھا پھر بھی اسپتال میں ان کا اتا پتا نہیں تھا۔

ڈاکٹر نے ’کنسنٹ‘ پر اس کے دستخط لینے سے پہلے اسے جو باتیں کہیں، وہ سن کر ایک بار اس کا دل کیا نانا جان کو ایسے ہی لے کر گھر لوٹ جائے مگر اگلے پل اس نے اللہ پر توکل کے ساتھ دستخط کر دیے۔

’او ٹی‘ کے باہر انتظار گاہ میں بیٹھے گھنٹوں گزر گئے مگر کسی نے آ کے تسلی بخش جواب نہیں دیا تھا۔

وہ دعائیں مانگنے میں مشغول تھی جب ارویٰ نے اسے سینڈوچ دیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کیا۔

”اچھا پانی تو پی لو۔“ ارویٰ نے اس کو بوتل تھمائی۔

اس نے ڈھکن گھمایا مگر ناکام رہی۔ وہ مکمل گھوم رہا تھا پھر بھی کھل نہیں رہا تھا۔ اس نے ارویٰ کو آواز دینے ذرا مڑ کے دیکھا اور اسی وقت شہود نے اس کے ہاتھ سے بوتل لے کر ایک جنبش میں کھول کے واپس کی۔

بوتل تھامتے ہوئے اس نے پوچھنا چاہا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے مگر پھر یاد آ گیا کارڈ اسی کا ہے۔ ہر ٹرانزیکشن کا ایس ایم ایس اور ای میل اسے پہنچ ہی رہا ہو گا۔ وہ واپس شاکر کے پاس جا کے کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں دھیمی آواز میں بات کر رہے تھے تب وہ چونکی۔ شہود ابھی ابھی نہیں آیا تھا۔ ارویٰ اور شاکر کو دیکھ کر لگ رہا تھا وہ بہت دیر وہاں موجود تھا۔

”شکر ہے خالہ نہیں ہیں یہاں!“ اسے گھورتے ہوئے وہ واپس اپنی دعاؤں اور اذکار میں لگ گئی۔ ذہن اس وقت کہیں اور الجھنے تیار نہ تھا۔

بڑی دیر بعد ڈاکٹر نے باہر آ کے کہا کہ سب ٹھیک ہے مگر ابھی وہ آئی سی یو میں منتقل ہوں گے اور وہیں کچھ وقت انھیں زیر نگرانی رکھا جائے گا۔

انتہائی نگہداشت میں ان کے پاس جانے کی اجازت نہ تھی۔ بس شیشے کے پار سے سب نے دیکھ لیا اور اب تک صبر کرنے والے ان تینوں کی آنکھیں نانا جان کو اس حال میں دیکھ کر بھیگ گئیں۔

رات ہو گئی تھی اور انھیں بس سے گھر جانا تھا۔ شاکر اسپتال میں رک رہا تھا اور ان دونوں کو جلد سے جلد گھر بھیجنے کے فراق میں تھا جب کہ وہ دونوں چاہ رہی تھیں کسی طرح نانا جان کو ہوش آجائے اس کے بعد وہ گھر کے لیے نکلیں۔

”میں فون بلکہ ویڈیو کال کرتا ہوں نا جیسے ہی انھیں ہوش آئے گا۔“ شاکر بولا۔

”لاسٹ بس بھی چلی گئی تو مشکل ہو گی۔“

وہ انتہائی نگہداشت کی انتظار گاہ سے باہر آئے تو شہود وہیں لابی میں موجود تھا۔ شاکر سے سننے کے بعد کہ وہ گھر جا رہی ہیں، اس نے اپنی خدمات پیش کیں جو اس نے فوراً مان لی۔

”نہیں شاکر۔ ہم چلے جائیں گے بس سے۔“

”جب شہود بھائی ہیں تو کیا ضرورت ہے، آپ ان کے ساتھ جائیں مجھے بھی تسلی رہے گی۔“

اس کا دل کیا پوچھے کہ ان کی اتنی دوستی کب ہوئی۔۔ شہود کے ان کے زندگی میں آنے سے پہلے اس کی تسلی کیسے ہوتی تھی؟ اسے شاکر پر بے حد غصہ آیا۔

”چلو قدسی۔“ اروٰی نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”ہم تھک گئی ہیں اور کل صبح واپس آنا ہے۔ اب ہاں نہ اور بحث میں ٹائم ویسٹ نہ کرو۔“ اس کے بہن بھائی ہی دشمن ہو رہے تھے تو وہ کیا کرتی۔

شہود، شاکر سے مصافحہ کرنے کے بعد باہر کی طرف چل پڑا۔

”ایک اجنبی کو اتنا سگا بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس کے جاتے ہی اس نے شاکر کو ڈانٹا۔

”آپ کے کزن ہیں وہ اجنبی کہاں سے ہو گئے، جائیں آپ دونوں۔ میں نانا جان کی اپ ڈیٹ دیتا رہوں گا۔“ ان کے جانے سے پہلے ہی وہ واپس انتظار گاہ کی جانب چلا گیا۔

وہ داخلی گیٹ کے قریب کھڑی تھیں۔ کچھ دیر بعد شہود کی کار پاس رکی۔ اس نے اس بار پچھلا دروازہ کھولا۔ اروٰی اگلی نشست پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ کوشش کرتی رہی کہ نیند میں اونگھنے جھومنے نہ لگے مگر کئی بار وہ جھٹکے سے جاگی تھی کہ نیند پر اس کا بس نہیں رہا تھا۔ آخر اس شرمندگی سے بچنے کے لیے اس نے پیچھے سر ٹکا کے آنکھیں بند کیں اور دوپٹا یوں پھیلایا کہ اس کا چہرہ چھپ جائے۔

گھر پہنچنے کے بعد اروٰی نے پیچھے مڑ کے اسے ہلایا۔ اس نے نیند سے بوجھل آنکھیں کھولیں۔

”گھر پہنچ گئے ہیں۔“ اس نے کچھ دیر اروٰی کو دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے اور پھر دروازہ کھول کر اتر گئی۔ جب وہ دروازے کا قفل کھول رہی تھی، پیچھے اروٰی اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اندر آنے کی دعوت دے رہی تھی۔ اس کا جواب سنے بغیر ہی وہ اندر چلی گئی۔

ذرا دیر بعد اروٰی تنہا ہی اندر آئی۔

”شاکر کو ٹیکسٹ کر دو ہم پہنچ گئے ہیں۔“ جوتے اتار کے الماری کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے اروٰی سے کہا۔

”اور۔۔۔“ کپڑے نکال کر پٹ کرتے بند ہوئے بنا پلٹے ہی گویا ہوئی۔

”اب پکانے کی ہمت نہیں ہے، فریج میں بریڈ کا پیکٹ تھا نا انڈے بنا لو پلیز، وہ ہی بریڈ سے کھا لیں گے۔ میں شاور لے کر نکلتی ہوں۔“

ان کے گھر میں اروٰی ہر قسم کے انڈے بنانے کی ماہر تھی لہٰذا یہ کام ہمیشہ اس کا ہی ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے باورچی خانے کا کوئی کام نہیں آتا تھا۔

وہ جب نہا کے باہر آئی تو آملیٹ یا انڈے پکنے کی مہک کی توقع کر رہی تھی مگر باورچی خانے میں ایسی کوئی ہلچل نہ دیکھ کر اسے لگا اروٰی سو گئی ہے۔ وہ خود ہی آملیٹ بنانے کے بعد اسے جگانے کا سوچتی اندر آئی تو ٹھٹھک گئی۔ اروٰی چھوٹی سی میز پر ڈبوں سے کھانا نکال رہی تھی۔

”اتنی جلدی آ گیا۔“ اس نے کرسی سنبھالی کہ ایک تو بھوک لگی تھی دوسری چائنیز کی خوشبو۔

”راستے سے پیک کروایا تھا۔“ اس نے اسی لیے بریڈ انڈوں سے کام چلانے کا سوچا تھا کہ باہر سے کھانا منگواؤ تو بڑی دیر سے آتا ہے۔

”شہود بھائی نے کہا اب کہاں گھر جا کے پکایا جائے گا۔“ اروٰی نے کانٹا نوڈلز کی رکابی میں رکھ کے رکابی اس کے آگے رکھی کہ اسے نوڈلز پسند تھے اور خود اسے چاول۔

”میرے باپ کے ہی پیسے ہیں۔“ سارے برے خیالات اور غصے کو پیچھے دھکیلتے ہوئے اس نے خود سے کہا اور کانٹا نوڈلز میں الجھایا۔

☆☆☆☆

اگلا دن پچھلے دن سے زیادہ تشویش اور فکر لیے بے دار ہوا تھا۔ اس وقت خالہ بھی موجود تھیں۔ وہ شاکر سے سننے کے بعد ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگی کہ وہ ہی زیادہ بہتر بتا سکتا تھا۔ دوپہر کے وقت ڈاکٹر سے ملاقات ممکن ہو سکی۔

جراحت کے نتائج ویسے نہیں تھے جیسی امید تھی۔ مزید کچھ ٹیسٹ اور انتظار کے بعد ڈاکٹر واضح کچھ بتا سکتے تھے کہ اگلے اقدام کیا ہوں گے۔ نانا جان اب بھی انتہائی نگہداشت میں ہی تھے۔ ان دونوں نے شاکر کو گھر بھیجا۔ وہ خالہ کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ اروٰی اس کے لاکھ اصرار کے بعد بھی جانے کے لیے نہ مانی۔

نانا جان ہوش میں آ گئے تھے۔ وہ باری باری ان سے مل بھی آئی تھیں لیکن ابھی انھیں مزید انتہائی نگہداشت میں ہی رکھا جانا تھا۔ وہ سب روز دوسرے شہر سے یہاں آنا جانا نہیں کر سکتے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ ہی رکے گی۔ شاکر اور اروٰی کی پڑھائی بھی متاثر ہو رہی تھی۔ اس کے فون پر اجنبی نمبر سے کال آئی تھی تو اس نے نظر انداز کر دی۔ جب تیسری دفعہ بھی اسی نمبر سے کال آنے لگی تو اروٰی نے کہا۔

”اٹھا لو۔“ اس نے کہنے کے ساتھ ہی سبز دائرے کو انگلی سے اوپر بھی کر دیا۔ اسے فون کان سے لگانا پڑا۔ دوسری طرف سعیدہ تھیں۔ نانا جان کی خیریت پوچھنے کے بعد انھوں نے کہا۔

”بیٹا اپنے گھر سے آنا جانا کرنے کی بجائے یہاں آجایا کرو آرام کے لیے۔ اپنے بھائی بہن سے بھی کہو وہ بھی کچھ دن ٹھہر جائیں گے۔ جگہ کا کوئی ایشو نہیں ہے۔“

”شکریہ آنٹی لیکن اروٰی اور شاکر کی کلاسس ہیں دونوں کل سے کالج جائیں گے۔ میں ادھر نانا جان کے پاس ہی رکوں گی۔ یہاں بھی آرام ہی ہے۔“

اروٰی نے اسے اشارے سے کچھ کہنا چاہا جو اس نے مکمل ان دیکھا کیا۔ انھوں نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا تاہم اسے پیار سے سمجھایا کہ کسی بھی وقت کال کرنے یا گھر آنے کے لیے اسے سوچنے اور جھجھکنے کی ضرورت نہیں ہے اور اس نے دل میں کہا، 'ہاں تو وہ میرے باپ کا گھر ہے۔'

وہ بھری بیٹھی تھی کہ اگر شہود آیا تو اسے صاف منع کر دے گی، اسے اس کے معاملات اور اس کے بہن بھائی سے زیادہ گھلنے ملنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ ان کا کچھ نہیں لگتا ہے۔ شام میں ملاقات کے اوقات میں شہود کے ساتھ سعیدہ کو دیکھ کر اس کا سوچا سمجھا سب یونہی رہ گیا۔ وہ نانا جان سے مل کر آنے کے بعد ان دونوں کو کینٹین چلنے کہنے لگیں۔

"نانا جان کے پاس ایک 'اٹینڈنٹ' کا ہونا ضروری ہے، آپ اروٰی کے ساتھ چلی جائیں۔"

”شہود ہے نا یہاں۔“ وہ پہلے ہی ایک کرسی سنبھال چکا تھا۔

”آؤ۔ تم دونوں صبح سے یہیں ہو تھوڑا باہر نکلتے ہیں۔“ انھیں جانا پڑا۔

اروٰی یوں سوال جواب اور باتیں کر رہی تھی، جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔

کیفے میں آکر انھوں نے ہی کاؤنٹر پر آرڈر دیا اور ٹرے لیے میز پر آئیں۔ جس میں کافی، پیسٹری اور برگر تھے۔

اس اسپتال میں وہ نانا جان کا علاج کبھی نہ کر پاتی اگر صحیح وقت پر ان کی زندگی میں شہود نہ آیا ہوتا۔ یہ بات وہ کتنی ہی بار سوچ چکی تھی۔ ہر بار وہ مالک دو جہاں کا شکر ادا کرنا نہیں بھولتی تھی۔

”تمھاری خالہ اور ماموں کہاں ہوتے ہیں؟“ وہ خاموشی سے کافی پی رہی تھی جب اروٰی سے گفتگو کے دوران انھوں نے اس سے پوچھا۔

”وہیں، ہم سب ایک ہی شہر میں ہیں۔ خالہ آئی تھیں شاکر کے ساتھ واپس گئی ہیں۔“

”اور ماموں؟“ وہ چپ رہی۔

”وہ ہم سب سے مع نانا جان ناراض رہتے ہیں۔“ اروٰی کا یوں کہنا اسے اچھا نہیں لگا کہ اپنے خاندان کے اختلاف دنیا کو سنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ سعیدہ نے اس کے بعد ان کی بابت مزید بات نہیں کی۔

وہ بڑی دیر بعد اوپر واپس آئی اسی وقت شاکر بھی آ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ماموں جان بھی تھے جو ان سب کو دیکھ کر حد درجہ حیران تھے۔ شہود سے پہلے سعیدہ نے اپنا تعارف کروادیا تھا۔ جسے سن کر ماموں جان نے اسے کیوں غصے سے دیکھا وہ سمجھ نہیں سکی۔ ان کا رویہ ان دونوں کے ساتھ روکھا اور سرد تھا۔

سعیدہ اور شہود کے جانے کے بعد ماموں نانا جان سے ملنے گئے۔ اس نے شاکر اور اروٰی سے کہا کہ وہ دونوں گھر جائیں، کالج جانا بھی شروع کریں کہ یہاں کتنے دن لگیں گے اور آگے ڈاکٹر کیا کہتا ہے کچھ علم نہیں تھا۔ تب تک وہ یہیں رکے گی، بار بار آنا جانا تھکانے والا اور مہنگا کام ہے۔

”یہ تو ان ایکسپیکٹیڈ تھا کہ سرجری مکمل کامیاب نہیں ہوئی تو باقی ایکسپینسز کا کیا؟ ہاسپٹل اسٹے بھی بڑھ گیا ہے۔“ شاکر کی فکر درست تھی۔

”میں کل ان سے بات کروں گی پھر بتاتی ہوں۔“ اس نے تسلی دی۔

ماموں جان باہر آئے تو کڑے تیوروں سے اس سے پوچھا۔

”کب سے ان لوگوں سے مل رہی ہو تم؟“ ان کا انداز یوں تھا کہ اسے بہت غصہ آیا۔

کبھی پلٹ کے خبر نہ لینے والے کس حق سے یہ سوال کرتے ہیں؟ کس طرح ان کے لہجے میں اتنا استحقاق آجاتا ہے؟ انھیں کیوں لگتا ہے جنھیں وہ ان کے حال پر چھوڑ چکے ہیں وہ ان کی مرضی اور پسند کے تابع ہوں گے؟ وہ اسے اپنے ددھیال والوں جیسے ہی لگتے تھے۔

”کچھ دن پہلے وہ ڈھونڈتے ہوئے آئے تھے۔“ اس نے بھی سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”اونہہ ڈھونڈتے ہوئے! زیادہ منہ لگانے کی ضرورت نہیں انھیں مجھے بالکل نہیں پسند۔“

قدسیہ خاموش رہی کہ اسی طرح غصہ ضبط ہو سکتا تھا۔ ان کے جانے کے بعد اروٰی اور شاکر بھی بڑی مشکل سے جانے تیار ہوئے۔

اسے رات میں نیند بھی نہیں آتی تھی کہ اللہ جانے کب نرس آکر کہے کہ نانا جان کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ کسی اور مریض کے رشتے دار کے لیے دروازہ کھلتا اور اس کا دل ڈوبنے لگتا۔ اندر سب ہی نازک حالت میں تھے۔ ڈاکٹر کے باہر آتے ہی آس اور یاس کے درمیان ڈولتے عزیز نم آنکھوں اور زیر لب دعاؤں کے ساتھ ڈاکٹر کی طرف بڑھتے تھے۔

وہ ’پریئر روم‘ سے فجر پڑھ کے آئی تو اپنے کاٹ پر لیٹنے کی بجائے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک بڑا سا ہال تھا جہاں بنکر بیڈس تھے۔ آئی سی یو کے مریضوں کا کوئی ایک عزیز وہاں رک سکتا تھا۔ جانے کتنی دیر بعد اس کی آنکھ کھلی۔ وہ کرسی پر ہی دیوار سے سر ٹکا کے سو گئی تھی۔ ہاتھ پیر سستی سے لمبے کرتے ہوئے اس نے یونہی نظر گھمائی اور ایک دم انداز بدل گئے۔ وہ جھٹ سیدھی ہوئی تھی۔

”آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ شہود بغل والی کرسی پر تھا۔

”آپ کیا رشوت دے کر آئے ہیں؟ یہاں بنا اٹینڈنٹ کارڈ کے کوئی نہیں آسکتا۔“

شہود نے شرٹ کی جیب سے کارڈ نکال کے اسے دکھایا۔

”اب یہ کیسے لیا وہ نہیں بتا سکتا مگر رشوت نہیں دی ہے۔“

”کیا ضرورت ہے لیکن؟“ اس نے سیدھا سوال کیا۔

”بی اماں اور میری اماں کا حکم ہے کہ بے چاری بچی اکیلی ہے کوئی تو ہو اس وقت اس کے ساتھ۔“

”دونوں اماؤں سے کہہ دیں بچی پچیس سال سے ان کے بنا سب سنبھال رہی ہے۔ اسے کسی کی ضرورت نہیں۔“

”شش۔۔۔ شش!“ شہود نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے ہونٹ پر انگلی رکھی۔ جوش میں اس کی آواز ذرا بلند ہو گئی تھی۔

”اسی لیے۔۔۔“ اس نے دبی آواز میں کہا۔

”آپ نہ آئیں، غصہ کنٹرول نہیں ہوتا مجھ سے۔“

”تو یہ تمھارا پروبلم ہے میرا نہیں۔“ قدسیہ نے سختی سے لب بھینچ کے اسے گھورا اور پھر اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

چند پل دونوں چپ رہے پھر شہود نے کہا۔

”ڈاکٹر نے کہا ہے آج سب ٹھیک رہا تو کل صبح وارڈ میں شفٹ کر دیں گے۔“

اول اس نے اہمیت نہ دیتے ہوئے سرسری سنا تاہم جلد ہی اطلاع کی گہرائی تک پہنچی اور پھر جذبات جھنجھنا اٹھے۔

”آپ کس ناتے سے ڈاکٹر سے ملنے گئے تھے؟“

”کسی ناتے سے نہیں۔“ اس کا اطمینان ہنوز قائم تھا۔

”اندر وزٹ کے بعد ڈاکٹر نے بیڈ نمبر ون ایٹ زیرو کے ریلٹیو کو پکارا تو آپ سو رہی تھیں۔“ اس کا انداز طنزیہ نہیں تھا مگر الفاظ سراسر طنز تھے۔

”مری نہیں تھی نہ بے ہوش تھی، اٹھ جاتی ایک آواز پر۔“

”میرے پاس جواب ہے مگر اب اس بحث کا مقصد؟ میں نے ڈاکٹر کا میسج پہنچا تو دیا۔“

”تو اب جائیں۔“ اس میں مروت یکایک غائب ہو گئی۔

”میں ڈاکٹر سے ملنے یا تمھیں ڈس اپائنٹ کرنے نہیں آیا تھا۔۔۔“ وہ رک گیا کہ آگے جو کہنے جا رہا تھا وہ بھی اسے گراں ہی گزرنے والا تھا۔

”شاید۔۔۔“ اس نے خود کلامی کی اور قدسیہ سوالیہ تاثر سے دیکھنے لگی۔

”بی اماں تمھیں یاد کر رہی ہیں۔ انھوں نے بھیجا ہے کہ تمھیں لے آؤں۔“

”آپ شاید سمجھے نہیں مگر میں نے ملتے رہنے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ ون ٹائم ملاقات تھی، کرلی۔“ اس نے مقدور بھر کوشش کی کہ لہجہ سادہ رکھے۔

”تم نے ان کی کنڈیشن دیکھی ہے۔ تمھارے چند پل اگر انھیں خوش کریں، ان کی راحت کا سامان بنے تو کیا برا ہے؟“ شہود کا انداز صلح جو سا تھا۔

”آپ یہ کنڈیشن دیکھ رہے ہیں۔۔۔ میں اس وقت نانا جان کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی۔“ اس نے بات طویل کرنے کی بجائے فی الوقت معاملہ ختم کیا تاکہ وہ چلا جائے۔

”میں ہوں یہاں تم ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ۔“ وہ انتظامات کے ساتھ آیا تھا۔

”اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے ایک ڈیبٹ کارڈ دے کر آپ نے غلام بنا لیا ہے تو غلط فہمی دور کر لیں۔“

”اگر ایسا ہوتا تو تم ابھی تک بی اماں کے سامنے ہوتیں۔“ شہود کی بات پر اس کا غصہ کم ہونے کی بجائے بڑھ گیا۔

”ایک بزرگ اور بیمار کی بے ضرر سی خواہش پوری کرنے میں تامل کیوں؟“

وہ ہونٹ بھینچے کچھ دیر اسے گھورتی رہی پھر گویا ہوئی۔

”اس بزرگ اور بیمار ہستی سے میری کوئی جذباتی اٹیچمنٹ نہیں ہے اور اس کا سہرا بھی اسی بزرگ اور بیمار کے سر ہے، اس لیے۔"

”ایموشنل اٹیچمنٹ نہ بھی ہو تو انسانیت اور اخلاق کی وجہ سے تو ملا جا سکتا ہے۔“

”بالکل، بہ شرط یہ کہ بزرگ اور بیمار نے آپ کی ماں کی زندگی مشکل نہ کی ہو۔“ اس کے پاس اور بھی جواز تھے مگر وہ بات کھینچنا نہیں چاہتی تھی۔

شہود اسے دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا مزید کچھ کہے یا اس وقت جانے دے، آخر وہ کھڑا ہو گیا۔ صاف تھا وہ مانے گی نہیں۔

”میں پھر آؤں گا۔“ وہ کہہ کر چلا گیا اور اس کے پیچھے وہ کتنی ہی دیر تک کڑھتی رہی۔

☆☆☆☆

نانا جان کو وارڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اب ڈاکٹرز کے مطابق کچھ دنوں میں ہی ان کی ایک اور سرجری ہونا تھی۔ کچھ پیچیدگیاں اور ان کا یکتا سا کیس سمجھانے کے لیے انھوں نے طبی اصطلاحات کے ساتھ ساتھ آسان زبان میں بھی سمجھایا تھا مگر اسے صرف ایک یقین دہانی چاہیے تھی کہ اس کے بعد وہ مکمل شفایاب اور تندرست ہو جائیں گے۔

"دیکھیں بیٹا ہماری کوشش تو پوری یہ ہی ہوتی ہے ہر سرجری کامیاب ہو، مریض صحت یاب ہو لیکن مریض کی عمر، مرض کی نزاکت اور کریٹیکل سپر وسیجرز میں کسی حتمی نتیجے کا وعدہ نہیں کیا جا سکتا مگر مایوس ہونے والی بھی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔" وہ پھر سمجھاتے رہیں لیکن اس کا دل پہلی بات پر ہی سہم گیا تھا۔

انھیں چھٹی مل گئی تو وہ گھر آ گئے۔ خالہ بھی بچوں کے ساتھ آ گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے نانا جان کو بھی بتا دیا تھا کہ آگے کیا ہونا ہے۔

دروازہ کھولتے ہی اسے ایسا شدید جھٹکا لگا کہ منہ کھلا رہ گیا۔

"شاید اروىٰ نے تمھیں بتایا نہیں۔۔۔" سعیدہ نے اس کہا۔

قدسیہ نے ضبط کر کے تبسم سجایا اور سلام کے بعد انھیں اندر آنے کی دعوت دی۔ سعیدہ اور شہود کے ہمراہ وہ یقیناً اس کے تایا تھے۔ اسے انھیں دیکھ کر حیرت تو ہوئی تھی لیکن اصل فکر گھر میں موجود خالہ کی تھی۔ نانا جان اس وقت ہال میں تھے۔ وہ ان تینوں کو وہیں لے آئی۔ باقی سب اندر تھے۔ تایا بڑی گرم جوشی سے نانا جان سے ملے۔ نانا جان بھی خوش نظر آ رہے تھے۔ ان دونوں کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ ایک دوسرے کا احترام کرنے والے اور ایک دوسرے کو پسند کرنے والے دو افراد بڑے دنوں بعد مل رہے ہیں۔

وہ ہال سے نکل کر ادھر آئی جہاں سب اکٹھا تھے اور اروىٰ کو گھورا۔

"خالہ!"

"کیا؟" انھوں نے ہنسی روک کے پوچھا۔

"وہ۔۔۔ آنٹی۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ میرے تایا اور آنٹی آئے ہیں۔"

یک لخت خالہ کا چہرہ بدل گیا۔

"کہاں ہیں۔۔۔ چلو میں رستے لگاتی ہوں انھیں۔" انھوں نے پلنگ سے اترتے ہوئے کہا۔

"خالہ!" قدسیہ نے ان کا ہاتھ تھاما۔

"وہ نانا جان کے پاس بیٹھے ہیں۔"

"کیا۔۔۔ تم نے۔۔۔"

"سوری خالہ مجھے کچھ سوجھا ہی نہیں مگر پلیز آپ ابھی کچھ نہ کہیں نانا جان کی طبیعت کا خیال کریں پلیز۔۔۔"

"ہاں خالہ۔" شاکر اٹھ کے پاس آیا۔

"آپ ادھر ہی رکیں۔۔۔ ہم دیکھ لیتے ہیں انھیں۔" وہ کہہ کے باہر چلا گیا۔

”تم سب کیسے۔۔۔“ ان تینوں نے ہمیشہ انھیں اس موضوع، اس ذکر پر غصہ ہوتے یا روتے ہی دیکھا تھا۔

”پلیز خالہ۔۔۔“ ارویٰ نے اٹھتے ہوئے دانیہ کو اشارہ کیا۔

”امی آپ بیٹھیں۔“ دانیہ نے ماں کو پکڑ کے بٹھایا۔

”کچھ دیر میں چلے جائیں گے۔۔۔ آپ جائیں قدسی آپی جلدی سے انھیں چائے پانی دیں تاکہ وہ جائیں۔“ وہ ایک بے بس سی نظر خالہ پر ڈال کے چلی گئی۔ اسے امید تھی کہ اندر ارویٰ، دانیہ اور دانیال خالہ کو سنبھال لیں گے جو حسب توقع غصے میں تھیں۔ شاکر ہال میں تھا۔ وہ باورچی خانے میں آگئی۔ اس نے انھیں پانی بھی نہیں دیا تھا۔ جب خفت زدہ سی وہ ٹرے لیے ہال میں آئی تو شاکر تایا کو نانا جان کی سرجری اور آگے کی تفصیل سنا رہا تھا۔ چائے بناتے ہوئے بھی وہ سب کی ہلکی ہلکی آوازیں سن رہی تھی۔ خلاف توقع شہود خاموش تھا۔

”کیا میرے ابا بھی ان کے جیسے تھے؟“ اچانک اسے خیال آیا۔ اس کی زندگی میں اپنے سگے والد کا ذکر نہ ہونے کے برابر تھا۔ پہلی بار اس نے تایا کو دیکھا تھا۔

جب وہ چائے لیے دوبارہ ہال میں گئی تو اس بار اس نے تایا کو بڑے غور سے دیکھا۔

”آؤ بیٹھو تم بھی۔“ سعیدہ نے اسے پاس بلایا۔ وہ ان کے قریب بیٹھ گئی۔

وہاں جمی محفل کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ برسوں بعد ملے ہیں وہ بھی ایک تلخ، تکلیف دہ موڑ پر ایک دوسرے سے دور ہونے کے بعد۔ وہ نانا جان کے چہرے کو دیکھتی تو خالہ کا چہرہ یاد آجاتا۔ کون اس کی ماں سے زیادہ محبت کرتا تھا؟ کس کا رویہ درست تھا؟ کس نے سب یاد رکھا تھا؟ کون سب بھلانا چاہتا تھا؟ نانا جان سے ہٹتی نظر بھٹکی اور شہود میں الجھی جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اسپتال میں اس دن کی بحث کے بعد سے وہ اسے آج نظر آیا تھا۔ سعیدہ نے درمیان میں دو تین بار فون پر بات کی تھی۔

وہ اٹھ کے خالی کپ اور کوکیز کی طشتری ٹرے میں رکھ کر باہر آگئی۔ کچھ دیر بعد وہ گئے اور خالہ باہر آئیں۔ وہ نانا جان کے سامنے کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں اس لیے صحن میں ہی دبی آواز میں شروع ہو گئیں۔

”یعنی ہم اتنے بے وقوف ہیں، ایسے گئے گزرے کہ ہماری کوئی اہمیت ہے نہ مرضی۔۔۔ وہ جب چاہیں گے ہم سے ملیں گے، جب حکم دیں گے ہم ان سے ملیں گے۔۔۔ تب بھی پیسوں کے دم پر انھوں نے سب کروایا تھا اور اب بھی اسی کا غرور ہے۔۔۔“ قدسیہ اپنی جگہ چور بن گئی۔

”لیکن خالہ وہ سب صرف دادای نے کیا تھا نانا باقی سب تو۔۔۔“

”ہاں باقی سب تو دودھ پیتے بچے تھے۔“ ان کی آواز ذرا اونچی ہو گئی۔

”امی!“ دانیہ نے تنبیہی انداز میں پکار کے آواز دھیمی رکھنے کا اشارہ کیا۔

وہ مجرم بنی سب یوں سنتی رہی جیسے وہ ہی دادی ہو، خالہ کا غصہ ایسا ہی تھا۔ ہر بار کی طرح اختتام اپنی بہن کو یاد کر کے رونے پر ہوا۔ اس دوران اسے یہ ڈر تھا کہ اندر نانا جان نے کچھ سن نہ لیا ہو۔

رات جب وہ سونے سے قبل آخری بار انھیں دیکھنے گئی تو انھوں نے پکارا۔

”قدسیہ!“

”جی نانا جان۔“ وہ لپکی۔ اسے لگا کہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی انھیں۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ اس کی فکر مند شکل سے جان گئے لہٰذا پہلے تسلی دی۔

”تم بیٹھو یہاں۔“

وہ ان کے پلنگ پر ہی بیٹھ گئی۔

”تم طاہرہ کی باتوں کی وجہ سے پریشان نہ ہو۔۔۔“ اور اس کا دل دکھ سے بھر گیا کہ وہ خالہ کی باتیں چکے تھے۔

”وہ زہرہ کی محبت میں غصہ کرتی ہے۔ اس نے جو دیکھا وہ پگلی اسے بھولتی ہی نہیں اور چاہتی ہے باقی سب بھی نہ بھولیں۔“ وہ آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔

”میں اس وقت کہنا چاہتا ہوں کہ تم طاہرہ کی وجہ سے ان لوگوں کے ساتھ اپنا رویہ سخت نہ رکھو۔“

”کیوں نہ رکھوں نانا جان؟“

”کیوں کہ وہ برے لوگ نہیں ہیں۔ سلطانہ بیگم غلط تھیں، انھوں نے غلط کیا مگر باقی گھر والے ان جیسے نہیں تھے۔“

”خاموش رہ کر غلط کا ساتھ دینا بھی تو غلط ہی ہے۔“ اس نے یاد دلایا۔ نانا جان مسکرا دیے۔

”زندگی کسی انسان کے قلم سے نکلی کہانی نہیں ہے بیٹا جہاں وہ سفید و سیاہ اور صحیح اور غلط میں ایک واضح لکیر کھینچ کر کرداروں کو منفی مثبت میں بانٹ دیتا ہے۔ وہ زہرہ کے جیٹھ دیور اور تمھارے تایا چاچا سے پہلے سلطانہ بیگم کے بیٹے تھے، جو کبھی ماں کے آگے آواز اٹھاتے تھے نہ نظر۔ پھر بھی انھوں نے کوشش کی تھی۔ اب ان کے حقیقی حالات تو انھیں ہی معلوم ہوں گے مگر ماں سے چھپ کر وہ جب بھی مجھ سے زہرہ سے ملیں شرمندہ دکھائی دیے، معذرت کرتے رہیں۔ آخر شفیع کے کہنے پر ہی میں نے شہر چھوڑا کیوں کہ وہ ماں کا مزاج جانتے تھے۔ شفیع نے اس وقت بہت مدد بھی کی اور اس وقت سلطانہ بیگم کی جو پوزیشن تھی، جو رعب اور طنطنہ تھا اس لحاظ سے اگر انھیں شفیع کی مدد کا علم ہو جاتا تو وہ کھڑے کھڑے اپنے بیٹے کو عاق کر دیتیں۔ انھوں نے بیٹوں یہ دھمکی بھی دے رکھی تھی۔ آخر کو ان کے بھی بیوی بچے تھے سب ڈرتے تھے۔“

”تو وہ اسی خاموشی اور چوری سے اتنے برس بھی تو رابطہ رکھ سکتے تھے، میں ان کے بھائی کی اکلوتی اولاد، آخری نشانی تھی۔“ جو کبھی سوچا بھی نہیں تھا، وہ شکوہ زبان پر آ گیا۔

”ہاں رکھ تو سکتے تھے مگر بیٹا۔۔۔“ وہ ذرا ٹھہرے۔

”مجھے دیکھو۔۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے لیاقت کے ساتھ زیادتی کی نا۔۔۔ وہ مجھ سے خفا ہے تو ٹھیک ہی ہے۔ میں نے زہرہ کی زندگی سنوارنے کا سوچا، سلطانہ بیگم سے مقابلے پر اتر آیا تو اس کا شکوہ بھی درست ہے کہ ابا نے بس ایک بیٹی کا سوچا، باقی اولاد کی پریشانی اور تنگی کو دیکھا ہی نہیں۔۔۔ تو یہ ہی زندگی ہے، ہمیں انتخاب کا موقع دیتی ہے اور پھر اس انتخاب کی قیمت وصول کرتی ہے۔“

ان کے لہجے کا دکھ اسے یکایک ایک نئی آگاہی دے گیا۔ وہ اس وجہ سے اس کے تایا چاچا وغیرہ کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے کہ انھوں نے زہرہ کو اہمیت دے کر بیٹے کو نظر انداز کیا تھا تو اس کے تایا چاچا نے بھی ماں کا انتخاب کر کے مرحوم بھائی کی اولاد کو چھوڑا تھا۔ وہ اپنے اور بیٹے کے بگڑے تعلق کو اپنا قصور مان رہے تھے اور ایسی ہی رعایت اس کے تایا چاچا کو بھی دے رہے تھے۔

”میں خیال رکھوں گی۔ آپ اتنا نہ سوچیں۔“

”شاباش!“ وہ مسکرائے۔

”اپنی دادی سے بھی ملتی رہو۔ جب یاد کرے چلی جایا کرو۔“

”مجھے ان سے کوئی انسیت محسوس نہیں ہوئی نانا جان۔“ اس نے ایمانداری سے کہا۔ وہ نانا جان سے جھوٹ کیا کہتی۔ وہ چاہتی تھی وہ بھی اس کی کیفیت سمجھیں۔

”کوئی بات نہیں۔ تمھیں کون ان سے زبردستی محبت کرنے یا اس کا جھوٹا اظہار کرنے کہہ رہا ہے؟ محبت یوں ڈیمانڈ پر نہیں ہوتی نہ کہیں سے ابھرتی ہے مگر بیٹا عمر کا لحاظ اور انسان کے پچھتاوے اور غلطی کے احساس کو بھی صفر نہیں کرنا چاہیے، اسے کچھ تو نمبر ملنے چاہیے۔“

وہ اب اپنی دشمن نمبرون کا مقدمہ لڑ رہے تھے۔ یہ تو ان کے خوش ہونے کا وقت تھا۔ ان کی اس حالت اور خواہش پر وہ بھی دادی کو ناکوں چنے چبواتے، قدرت کے اس انتقام پر مطمئن ہوتے، ان سے سارے بدلے لیتے اور اگر اسے ملاقات کرنے بھی دیتے تو گردن اکڑا کر ساتھ جاتے اور انھیں اس انداز میں جتاتے کہ وہ نظر اٹھا کر دیکھنے کے قابل نہ رہتیں مگر اس کے نانا جان نے بنا اگر مگر اور شرائط کے حقیقتاً درگزر کا چنا تھا اور اسے بھی وہی درس دے رہے تھے۔

”وعدہ نہیں کرتی کوشش ضرور کروں گی۔“ اس نے کہا۔

”اب آپ زیادہ سوچیں نہیں سو جائیں۔“

”آپ ابھی تک ادھر ہی ہیں؟“ شاکر اندر داخل ہوا۔

”بس جا رہی ہوں۔“ وہ ان کا لحاف درست کرتی کھڑی ہو گئی۔ شاکر نانا جان کے کمرے میں فرش پر بستر لگا کر سو رہا تھا۔ وہ سب کی احتیاط برت رہے تھے۔

وہ کمرے میں آئی تو سب سو گئے تھے۔ اس کی نیند اڑ چکی تھی۔ نانا جان کی باتیں سوچتے ہوئے وہ خود کو بڑی مشکل میں محسوس کر رہی تھی۔ اسے اندازہ تھا اس کا دادی سے ملنا جلنا یا ان لوگوں کا یہاں آنا جانا خالہ کو اچھا نہیں لگے گا اور وہ ان کے جذبات بھی سمجھتی تھی۔ خالہ نے اپنی مشکل زندگی اور تنگی کے باوجود ہمیشہ ان سب کا ساتھ دیا تھا۔ سب کو محبت دی تھی۔ انھیں بھی نانا جان سے کچھ شکایتیں تھیں لیکن انھوں نے ماموں کی طرح انھیں چھوڑا تھا نہ باپ کے ساتھ اپنا رویہ برا رکھا تھا۔ اس کے بدلے وہ اب انھیں یہ دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ اس کے ددھیال سے خالہ کی نفرت جانتی تھی اور ایسے میں ددھیال سے تعلقات استوار کرنا، مصنوعی اور رسمی ہی سہی خالہ کے ساتھ زیادتی تھی۔

خالہ کو سوچتے سوچتے اسے شہود یاد آ گیا۔

”آج تو زبان بند تھی۔ کیا میری اس دن کی باتیں بری لگ گئی ہیں؟ لگتی رہیں مجھے کیا میں نے غلط تو نہیں کہا تھا۔“

☆☆☆☆

اگلے دن خالہ کی واپسی تھی۔ خالو انھیں لینے آ رہے تھے۔ نانا جان کے لیے شاکر نے صحن میں آرام کرسی بچھا دی تھی کہ وہ اندر کمرے میں لیٹے لیٹے اکتا گئے تھے۔ کھانے پر خالو کی وجہ سے اہتمام کرنا تھا۔ وہ سادہ مزاج تھے۔ ان کے نخرے نہیں تھے کہ سسرال میں آؤ بھگت اور خاطر مدارات پر شکوے شکایت کرتے مگر وہ بہت کم آتے تھے، وجہ روزگار تھا۔ لہذا جب بھی آتے وہ اہتمام کرتی تھی۔ وہ بریانی دم پر رکھ کے باورچی خانے سے نکلی تو خالہ کے علاوہ سب ہال میں ٹی وی کے آگے بیٹھے تھے۔ اس نے ہال کا دروازہ بند کیا اور صحن کی طرف بڑھی۔ اس کی جانب پشت کیے وہ دونوں گہرے مذاکرے میں مشغول تھے۔ وہ دور ہی رک گئی۔

”آپ کی طرح اتنا بڑا ظرف نہیں ابا میرا۔“ خالہ کی آواز خفا سی تھی۔

”میں کہاں تم سے کہہ رہا ہوں کہ معاف کر دو، میں تمھیں اپنے خیالات بدلنے بھی نہیں کہہ رہا ہوں۔ صرف ان کے اظہار میں احتیاط برتو تاکہ اگر قدسیہ اپنے ددھیال سے روابط رکھنا چاہے تو تمھاری نفرت اور غصہ اس کے پیر کی بیڑی نہ بنے۔“

”قدسی کیوں اس سے کوئی واسطہ رکھنا چاہے گی۔ اسے مجھ سے زیادہ اپنی ماں کا خیال ہو گا اور وہ لوگ اس لائق ہیں بھی نہیں کہ ان سے رشتہ رکھا جائے۔“ وہ تلخی سے بول رہی تھیں۔

”یہ غلط بیانی ہے بیٹا۔ سلطانہ بیگم کے علاوہ باقی کسی نے زہرہ کا برا نہیں چاہا نہ ہمیں ستایا۔“

”ہاں خاموش تماشائی بنے رہیں۔ اس کا تمغہ ملنا چاہیے انھیں۔“

”طاہرہ بیٹا یہ لاحاصل بحث ہے۔ تم ان سب کو ایک نظر سے دیکھتی ہو اور یکساں قصوروار گردانتی ہو جب کہ میرے لیے شجاع کے بھائی سلطانہ بیگم جیسے قصوروار نہیں ہیں۔ شفیع تو اس قدر نیک اور سمجھدار ہے کہ اگر اپنے بعد دنیا میں قدسیہ کے کسی سگے محرم اور خونی رشتے کو اس کی مکمل ذمہ داری سونپنے کا موقع ہو تو اسے بے جھجک سونپ دوں۔ شفیع ہی تھا جس نے ہمیں اپنی ماں سے دور جانے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ اپنی ماں کو روک نہیں سکتے تھے مگر زہرہ کی بھلائی بھی سوچی۔“

”ابا آپ مجھ پر بھروسا کرنے کی بجائے انھیں سونپ دیں گے؟“ خالہ کی آواز صدمے سے چور تھی۔

”کیسی فضول بات ہے۔ مجھے تم پر بھروسا کیوں نہیں ہو گا۔۔۔“ ناناجان نے جھلا کر کہا۔

”مگر ایک مضبوط سرپرستی جو اسے دنیا میں ہر طریقے سے محفوظ رکھ سکے وہ خالہ کی نہیں تایا کی ہو گی اور یہ میں نے مثال دی ہے۔“

”خالہ! فون تو کریں خالو کو کہاں تک پہنچے ہیں۔“ وہ وہیں سے بولتی ان کے پاس آئی۔ فضا میں پھیلا تناؤ کٹ سے ٹوٹ گیا۔

”ہاں کب کے نکلے ہیں، آجانا چاہیے تھا۔“ وہ بھی بازو سے فون اٹھا کر گویا ہوئی۔

شام تک وہ سب چلے گئے۔ دو دن بعد ناناجان کو پھر ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا۔

رات میں اروی کے فون پر سعیدہ کی کال آئی۔ اس نے بات کر کے فون قدسیہ کو تھما دیا۔ ناناجان بھی وہیں موجود تھے۔ اسے بات کرنا پڑی۔ جب فون رکھا تو انھوں نے پوچھا۔

”کیا کہہ رہی تھیں؟“

”آپ کی طبیعت کا پوچھا۔“

”اور؟“ حالاں کہ باتوں سے انھیں اندازہ تھا کہ کیا بات ہوئی ہے پھر بھی وہ اس سے سننا چاہتے تھے۔

”مجھے گھر بلایا ہے کہ دادی یاد کر رہی ہیں۔“

”مل آؤ۔“ انھوں نے اسے دیکھا۔

”آپ مکمل ٹھیک ہو جائیں پھر جاؤں گی۔“

”میں اب بھی ٹھیک ہوں بیٹا۔ کچھ دیر کی بات ہے، مل آؤ۔“

”جی۔“ وہ انھیں انکار کر سکتی تھی نہ ان سے بحث کر سکتی تھی۔

اروی کو فون واپس دیتے ہوئے اس نے اسے غصے سے دیکھا جو اس نے نظر انداز کر دیا۔

☆☆☆☆

اگلے دن ابھی ناشتے سے فارغ ہوئے تھے کہ دروازے کے آگے پھر وہی کار آرکی۔

”یہ کیا مذاق ہے۔ جب منہ اٹھا کے لینے آئیں گے اور میں کام کاج چھوڑ کے ان کے ساتھ چل پڑوں!“ وہ شہود کو دیکھتے ہی چڑ گئی۔

”کل کہا تو تھا آنٹی نے وہ لینے بھیجیں گی۔“

”تم زیادہ سگی مت بنو ان کی۔“ اس نے اروی کو جھڑکا۔

”تم سے زیادہ کسی کی سگی نہیں میں اور سعیدہ آنٹی اچھی لگی ہیں مجھے ان فیکٹ ان کی پوری فیملی۔“

قدسیہ نے خود کو الجھنے سے روکا۔

جب وہ نانا جان کے ساتھ بیٹھا بات کر رہا تھا، قدسیہ کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ نانا جان نے اس کے سامنے ہی اسے تیار ہونے کو کہا تھا۔ وہ نانا جان کے سامنے اپنی کوفت نہیں دکھانا چاہتی تھی نہ شہود کو خوش ہونے کا موقع دے سکتی تھی کہ وہ اسے اس کی مرضی کے بنا دادی سے ملوانے لے جانے میں کامیاب رہا ہے۔

اروی کو ہدایتیں دیتی وہ گھر سے باہر آئی جہاں شہود انتظار کر رہا تھا۔

اس کے اندر بیٹھ جانے کے بعد بھی اروی اور اس کی باتیں ختم نہیں ہو رہی تھیں۔

”اندر جاؤ۔ نانا جان اکیلے ہیں۔“ آخر اسے کہنا پڑا۔ شاکر اس وقت گھر پر نہیں تھا۔

”اللہ حافظ۔“ وہ ہاتھ ہلاتی دروازے کی سمت بڑھی۔

کار میں خاموشی تھی۔ نہ اس دن گھر میں ان دونوں نے بات کی تھی نہ آج۔ وہ بے نیازی سے کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی مگر کان یوں اس کی طرف لگے تھے کہ اب اس نے مخاطب کیا ہی کیا۔

اسے خبر ہی نہیں تھی کہ وہ کس قدر گہری سوچ میں ڈوبا تھا، پچھلے دنوں اس کی ذات کس حیثیت سے موضوع بنی تھی اور ان دو ملاقاتوں کی چپ کا راز وہ حیثیت ہی تھی۔

اس کی بی اماں بدلی تھیں مگر اتنی بھی نہیں۔ ان کی ہٹ دھرمی اور اپنی بات منوانے کی صلاحیت اس عمر بھی جوں کی توں تھی تو ان کی اولاد اس عمر کو پہنچ جانے کے بعد بھی ماں کے آگے ہر حال میں سر جھکانے والی فرمانبرداری کی قائل ہی رہی تھی۔

جب بڑی دیر تک شہود کی آواز نہیں ابھری تو اس نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ ماتھے کی ہلکی سی شکن اور سڑک پر ٹکی آنکھیں گہری سوچ کی غماز تھیں۔

”اچھا ہی ہے سکون سے سفر تو ہو رہا ہے۔“ اس نے گردن سیدھی کر کے پیچھے ٹکائی اور آنکھیں بند کر لیں۔

شہود نے ذرا سا سر گھما کے دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے تھیں۔ اس نے ایک نظر سیدھی سنسان سڑک پر ڈالی اور پھر بغور اسے دیکھا۔

سفید اور سیاہ امتزاج والے جوڑے میں اس کی سانولی سی رنگت اور بند آنکھوں والے چہرے میں بھی جاذبیت تھی۔ اعتماد تو وہ اس کا پہلی ملاقات سے دیکھ رہا تھا۔

دوبارہ نظر سامنے کرتے ہوئے اس کا دھیان ہلکورے لیتے اور قدسیہ کے رخسار کو چھوتے جھمکے میں الجھ گیا تھا۔

کار جب جھٹکے سے رکی تو وہ جاگی۔ وہ متحیر سی سیدھی ہوئی کہ وہ سارا رستہ سوتی آئی ہے۔ اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا، بالوں کو ہاتھ سے ٹٹولا اور چند مرتبہ آنکھیں پوری کھولیں اور میچیں تاکہ سوئے رہنے کا تاثر صورت سے غائب ہو۔ اپنا سیاہ کنارے والا سفید دوپٹا درست کر کے اس نے کھڑکی سے باہر سائیڈ ویو مرر میں خود کو دیکھا۔ شہود دروازہ کھول کے باہر نکلا تو وہ بھی اتر گئی۔ پورچ میں سعیدہ کے ساتھ کئی نئے چہرے تھے۔

"آج اتنے سارے لوگ کیوں ہیں؟" اتنے اجنبی، اس سے ملنے کے لیے کھڑے تھے اور سب اس کے کچھ لگتے تھے۔ اچانک گھبراہٹ میں بڑا بے ساختہ جملہ پھسلا۔ شہود نے رک کے اسے دیکھا۔ ہمیشہ حاوی رہنے والی پر اعتماد قدسیہ پہلی بار اسے ہراساں ہرنی سی لگی۔

"آج چھٹی ہے اور سب تم سے ملنے اس وقت گھر میں موجود ہیں۔" شہود کی اطلاع پر اس نے اسے دیکھا۔

"آؤ، کوئی بھی آدم خور نہیں ہے۔" وہ شاکی نظروں سے اسے دیکھتی اس کے ساتھ آگے بڑھی۔ یہ فاصلہ طے کرتے ہوئے اس نے اعتماد بحال کر لیا تھا۔

وہ اپنے چاچا اور دوسرے تایا سے پہلی بار ملی۔ شہود کی بہن عراضہ اور باقی چچازاد اور تایازاد کا تعارف ہوا۔ بہار، حیا، بانو اور نادر۔

تعارف کے فوراً بعد ہی سعیدہ اسے بی اماں کی خواب گاہ میں لے گئیں۔

"کتنا ترسایا تم نے مجھے۔" اسے دیکھتے ہی انھوں نے بانہیں وا کیں اور وہ دل پر جبر کر کے ان کے بانہوں میں سما گئی۔

"شجاع کی خوشبو آتی ہے تم سے۔" ان کی آواز رندھی سی تھی مگر اس کا دل کیا کہے۔

" میں زہرہ کا بھی خون ہوں، مجھ میں دونوں کی خوشبو ہے۔" مگر وہ سوچ کے رہ گئی۔

بڑی دیر بعد انھوں نے اسے خود سے الگ کیا۔

"تمھارے نانا کیسے ہیں اب؟"

"اللہ کا کرم ہے۔ کافی بہتر ہیں۔"

"مجھے شہود نے بتایا دوبارہ آپریشن ہو گا ان کا۔"

"جی۔"

"فکر نہ کرو، اچھے ہو جائیں گے۔" انھوں نے تسلی دی اور ان کی یہ پہلی بات اسے اچھی لگی۔ اگلے لمحے دل کیا یاد دلائے کہ انھوں نے کبھی کس قدر ستایا تھا اس کے نانا جان کو مگر خاموش رہی۔

ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد اچانک وہ اسے شجاع احمد کے بچپن کے قصے سنانے لگیں۔ پہلے اسے ذرا دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بے زاری سے سن رہی تھی مگر پھر اسے احساس ہی نہیں ہوا وہ نہ صرف غور سے سن رہی تھی بلکہ ان کے ساتھ مسکرا بھی رہی تھی۔

"ارے واہ ماشاءاللہ دادی پوتی تو مگن ہو گئیں سب بھول کر۔" جب سعیدہ نے آ کر کہا تو وہ ٹھٹھکی۔ اچانک ہی لگا جیسے کوئی جرم سرزد کر بیٹھی ہے۔

"آؤ سب لنچ پر تمھارا ویٹ کر رہے ہیں۔" وہ اسے ساتھ لے جانے آئی تھیں۔

یہاں آ کر اس کی مرضی چلتی ہی کہاں تھیں۔ وہ سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھانا چاہتی تھیں مگر جب سب انتظار کر رہے تھے تو بے مروت بن کے انکار کرنا یا ضد میں یہیں بیٹھے رہنا بھی ان سب کو اہمیت دینے جیسا تھا جب کہ اس وقت اسے اہمیت مل رہی تھی یہ الگ بات وہ نہیں چاہتی تھی۔

میز پر بھی وہ بظاہر اعتماد سے سب کے سوالوں کے جواب دیتی رہی مگر اب وہ جلد سے جلد یہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ کرسی سنبھالتے ہوئے اس نے سب سے پہلے پانی کے جگ اور گلاس کو دیکھ کر سکون کا سانس لیا تھا۔

ناناجان اور اروی کے اکیلے ہونے کا جواز دے کر وہ مزید رکی نہیں۔ بی اماں نے اسے جلد دوبارہ آنے کو کہا تو آبدیدہ تھیں۔ اس کا دل اب بھی ان کے لیے کچھ محسوس نہیں کرتا تھا۔

"میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔ شہود تھک گیا ہو گا۔" جب وہ سب اسے چھوڑنے پورچ تک آئے تو نادر نے پیشکش کی۔

اس نے شہود کی سمت دیکھا جو ان سنی کرتے ہوئے کار کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے تقلید کی۔

واپسی میں وہ دونوں پھر خاموش تھے۔

"ملتی رہو گی تو بی اماں اجنبی نہیں رہیں گی۔" اچانک شہود نے کہا۔

سعیدہ کھانے کی میز پر سب کو بتا چکی تھیں کہ وہ بڑی دلچسپی سے دادی کو سن رہی تھیں اور بی اماں کس قدر خوش تھیں۔

"آنٹی نے بس دیکھا، لیکن مجھے ان کی باتیں کس قدر اجنبی اور پرائی لگ رہی تھیں، میں ہی جانتی ہوں۔"

"وہ ہی تو پوائنٹ ہے۔ ملتی رہو گی تو نہیں لگیں گی۔"

"میں نے شجاع احمد کا نام بس ڈاکیومنٹس پر دیکھا اور ذکر تو شادی ہی سنا کیونکہ میری زندگی میں ابا کا مقام، رتبہ فاروق شیخ کا تھا۔ میں ابا کی جگہ انھیں ہی دیکھتی اور سوچتی ہوں۔ اگر بچپن سے دادی مجھے، یہ ہی قصے سناتیں، اس بہانے ملتیں تو شاید میں آج اپنے سگے باپ اور دادی سے اتنی اجنبیت محسوس نہ کرتی، ان سے وہ سب سننا، آپ سب سے اس عمر میں ملنا آکورڈ نہیں لگتا، آپ سب کی زندگیوں میں یہ رشتے بچپن سے لے کر آج تک سیٹ اور فکس ہیں، مجھے اچانک اور زبردستی ملے ہیں اس لیے مجھے بھاشن بالکل نہ دیں۔"

شہود کو لگا جیسے وہ لاجواب ہو گیا ہو۔

"جو ہو گیا وہ بدلا نہیں جا سکتا۔" کچھ دیر بعد وہ کہنے لگا۔

”لیکن کیا پاسٹ مسٹیکس کی وجہ سے اب ہم کچھ اچھا ہونے ہی نہ دیں؟“

”اس کا فیصلہ اسے کرنے دیں جس کے ساتھ غلط ہوا ہے۔“

”وہ تو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔“

”میں تو ہوں۔ نانا جان تو ہیں۔“ وہ تڑخ گئی۔

”تم سمجھی نہیں۔“ شہود تحمل کا دامن تھامے تھا۔

”بی اماں کے آبسیشن کی وجہ سے یہ ایک طرح سے باقیوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ تمھیں اور چاچی کو ان سے دور کر دیا جائے، چھپا دیا جائے۔ اس فیصلے کی وجہ سے یہ ہوا کہ چاچی کا دوبارہ گھر بنا فیملی بنی۔ انھوں نے سکون سے زندگی گزاری۔ ہاں اس فیصلے کا کولیٹرل ڈیمج تم تھیں کہ تم سے فادر کی سائیڈ کے رشتے چھوٹ گئے بلکہ ہم سب تھے کہ ہم سے بھی ایک کزن بچھڑ گئی۔۔۔“ اس نے قدسیہ کو گہری نظر سے دیکھا جو حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ بات کو کہاں سے کہاں لے گیا تھا کہ اب وہ بھی قابل ہمدردی ہو گیا تھا۔

”جو بھی ہوا وہ ہمارے بڑوں اور بزرگوں نے کیا۔ ان سب میں ہمارا کوئی سے تھا ہی نہیں تو ہم کیوں نارمل نہیں رہ سکتے؟ کیا ہم بڑوں کے جھگڑے، غلطیاں، اختلاف ان تک ہی نہیں رکھ سکتے؟“

”دنیا ایسے فنکشن نہیں کرتی۔“ اس نے اروی کا جملہ دہرایا۔

”کرنا چاہیے۔ ایسا ہو تو نفرتیں اور دشمنیاں جنریشنز کے ساتھ آگے نہیں بڑھے گی۔“ اسے لگا وہ بھی اروی کی طرح ناول پڑھتا ہے۔

”ہم اپنے بڑوں سے محبت کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ہوا ظلم زیادتی، دکھ، ان کے جانے کے بعد اٹھا کے بغل والی قبر میں دفنا نہیں دیتے نہ ان سے محبت ختم کر سکتے ہیں۔ ایسا اسی وقت ممکن ہے جب جانے والوں کے ساتھ ان کی محبت بھی چلی جائے، عمر کے ساتھ جذبات احساس بھی بوڑھے ہو جائیں اور ایسا ہوتا نہیں ہے۔“ وہ ایک بار پھر جوش اور غصے میں تھی۔

”اچھا۔۔۔ میں نے تمھارا، نانا جان یا چاچی کسی کا کچھ برا نہیں کیا پھر یہ بتاؤ تم نے مجھ سے کس لیے ایسا رویہ رواں رکھا ہے؟“

”کیسا رویہ؟“ قدسیہ نے رخ اس کی طرف کیا۔

”دشمنی والا۔“

”ہماری کوئی دشمنی نہیں۔“ وہ سیدھی ہو گئی۔

”دوستی بھی تو نہیں۔“ شہود کا لہجہ شکایتی تھا۔

”وہ ضروری بھی نہیں۔“

”دشمنی بھی نہیں دوستی بھی نہیں تو پھر کیا؟“

”کچھ نہیں۔ آپ دادی سے ملنے کی فرمائش نہ کریں اور اس مقصد سے گھر نہ آئیں تو کسی تعلق یا نام کی ضرورت نہیں۔“

”اب تم حقیقت سے انکار کر رہی ہو۔ ہم کزنز ہیں۔“

”تو بس یہ ہی یاد رکھیں، اسے دوستی دشمنی میں نہ بانٹیں۔“

”تمھیں اچھا نہیں لگے گا مگر تم میں ضد اور ہٹ دھرمی بالکل بی اماں والی ہے۔“

”مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔“ اس نے جھٹ کہا اور شہود بے ساختہ مسکرا دیا۔ وہ جز بز سی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

”اس سے تو اچھا تھا میں سو ہی جاتی۔“ اس نے بھاگتے منظروں کو دیکھ کے سوچا۔

☆☆☆☆

وہ نانا جان کو ڈاکٹر کے پاس لے گئی اور ساری جانچ پڑتال کے بعد اگلی سرجری کے لیے اس نے مزید کچھ دن رکنے کا کہا۔

واپسی میں نانا جان نے اس سے ایک بار پھر اخراجات اور پیسوں کا پوچھا تو اس نے وہی بہانہ گھڑا۔ اس نے انھیں اصل بل سے کئی کم رقم بتائی تھی کہ اب تک اتنا خرچ ہوا ہے۔

ماموں کو ان کے دوسرے آپریشن کی خبر کیا ملی کہ وہ اسے نانا جان کی دنیا سے روانگی کا پروانہ سمجھ کر دوڑے آئے۔

”ابا! بعد کے معاملات کتنے مشکل اور پیچیدہ ہو جاتے ہیں اور پیسے بھی بہت لگتے ہیں۔ اب تو ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنانے بھی رشوت دینا پڑتی ہے۔ آپ اپنی زندگی میں ہی یہ میرے نام کر دیں۔ بعد میں دفتروں میں کھپنے کے لیے میرے پاس وقت ہے نہ دینے کے لیے پیسے۔“ انھوں نے کسی لگی لپٹی نے بنا دوٹوک بات کی۔

وہ ان تینوں کی ذرا نہیں سنتے تھے۔ اس کی تو بالکل بھی نہیں۔ فاروق شیخ کے گھر والوں کی طرح ہی اس کے سگے ماموں نے بھی اسے کبھی اپنا نہیں سمجھا تھا۔ اسے شہود کی بات یاد آئی اور اس نے سوچا کہ کاش ایسا سچ میں ممکن ہوتا کہ ہم بڑوں کے جھگڑے، غلطیاں، اختلاف ان تک ہی رہنے دیتے۔ اس نے تو ماموں کے ساتھ کچھ غلط نہیں کیا تھا مگر وہ ان کی نفرت اور بے رخی کی حق دار ٹھہری تھی۔

”کیا چاہتے ہو تم؟“ نانا جان نے تھک کے پوچھا۔

”گھر کے کاغذات دے دیں باقی میں سب سنبھال لوں گا۔ "

نانا جان خاموشی سے اٹھ کے اندر چلے گئے۔ ماموں کا چہرہ کھل اٹھا اور ان کے دل بیٹھنے لگے۔ کیا اب چھت بھی چھن جائے گی۔ اس نے نانا جان کے پیچھے جانا چاہا تو شاکر نے ہاتھ پکڑ کے روک لیا۔

کچھ دیر بعد وہ واپس آئے اور دو تین فائلیں ماموں جان کے آگے پٹخی۔

"یہ گھر زہرہ کا ہے۔"

ماموں جو پہلے ہی ایک فائل اٹھا کے دیکھ رہے تھے، تیزی سے صفحے پلٹنے لگے۔

"یہاں آنے کے بعد میں نے اپنی ساری جمع پونجی تمہاری ماں کے کہنے پر تمہارے کاروبار میں لگادی تھی جو تم چند مہینوں میں ڈوبو بیٹھے تھے۔ یہ گھر زہرہ اور قدسیہ کو شجاع کے ورثے سے ملے پیسوں سے خریدا تھا۔ اب اس گھر کی آس میں میرے مرنے کا انتظار کرنے کہ بجائے کچھ ہاتھ پیر چلا کے کمانا سیکھ لو۔" وہ تھکے سے بیٹھ گئے۔ جب کہ اپنے سر پر گرے آسمان نے قدسیہ کو کہیں کا نہیں رکھا تھا۔

ماموں جان اول فول بکے جارہے تھے مگر اب شاکر نے آگے بڑھ کے ان کے ہاتھ سے فائلیں لیں اور انھیں جانے کو کہا۔ وہ آپے سے باہر ہی ہوگئے۔ ان سب کو دیکھ لینے کی دھمکی دیتے وہ چلے گئے۔ سب سے پہلے ارویٰ نانا جان کے پاس دوڑی۔

"سلی سا سوال ہے مگر مجھے ابھی یہ ہی پریشان کر رہا ہے کہ وہ اتنے امیر لوگ اور شجاع احمد کا اتنا سا ورثہ؟"

"اروی!" شاکر نے اسے ڈانٹا۔

"بولیں نانا نانا جان۔" اسے ایسی باتوں پر صبر بھی نہیں ہوتا تھا۔

"اس وقت ان کا کاروبار اس قدر پھیلا نہیں تھا۔ امیر اس وقت بھی تھے مگر اتنے نہیں اور پھر زہرہ نے بس وہ لیا جو شرعی طور پر اس کا اور قدسیہ کا تھا۔ صرف ایک بیٹی ہو تو پھر دیگر رشتے داروں کے حصے بھی ہوتے ہیں۔ تمھیں سمجھ نہیں آئے گا۔ پھر بہت پیسہ یہاں وہاں جانے اور سیٹل ہونے میں لگ گیا۔ میرے پاس تو کچھ بچا نہیں تھا۔ کچھ رکھی رقم تمھاری نانی کی بیماری پر لگ گئی کچھ فاروق کے وقت باقی زہرہ کے۔۔۔"

"اٹھو۔" شاکر نے اس کا ہاتھ کھینچ کے اٹھایا۔

"نانا جان آپ بھی کسے حساب کتاب دے رہے ہیں۔"

"میں تو سوچ رہی تھی اب دادی کے وارد ہونے پر ہماری قدسیہ میلینئر بن جائے گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

قدسیہ مرے مرے قدموں سے اپنے کمرے میں آگئی۔ اس نے کیا کر دیا تھا۔ اس کے اپنے الفاظ ہی اسے زمین میں دفن ہو جانے کہہ رہے تھے شرمندگی اتنی تھی۔

☆☆☆☆

اگلے دن خالہ کا فون آیا تو اس نے پوچھ لیا۔ وہ سب جانتی تھیں مگر مانتی نہیں تھیں۔

"بے وقوف بنایا تھا ابا اور زہرہ کو اتنے سے پیسے پکڑا کے۔ وہ تو امی نے منع کر رکھا تھا کہ بھائی کو علم نہ ہو گھر کا اس لیے آج تک زبان بند رکھی تھی ورنہ تو۔۔۔"

اب زبان بندی ختم ہو گئی تھی لہٰذا رکنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ انھیں اس کے ددھیال کے اس قصور پر پہلی بار بولنے کا موقع ملا تھا۔

جس دن انھیں اسپتال داخل ہونا تھا اس سے ایک دن پہلے شام میں پھر سعیدہ اور شفیع احمد حاضر تھے۔ آج ان کے ساتھ شہود نہیں تھا اور وہ شکر ادا کر رہی تھی کہ وہ نہیں آیا۔ اس نے بہت سوچنے کے بعد نانا جان کے آپریشن کے لیے پھر وہی کارڈ استعمال کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس کارڈ اور اس قرض کا کیا کرنا ہے وہ نانا جان کی اسپتال سے گھر آنے کے بعد دیکھا جائے گا۔

رات وہ سونے کی تیاری کر رہی تھی تب نانا جان نے اسے بلایا۔

”بیٹھو۔“

اس کا مطلب کوئی اہم اور طویل بات تھی۔

”زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے جب لکھی ہے تب ہر حال میں آنی ہے اور اب میری عمر وہ ہے کہ کسی بھی پل بلاوا آسکتا ہے۔۔۔“ اہم سرجری سے پہلے ان کے منہ سے یہ سب باتیں، وہ لرز گئی۔

”نانا جان!“

”اروی اور شاکر کے لیے لیاقت کا دل پتھر نہیں اور ان کا ددھیال بھی دونوں کی فکر کرتا ہے مگر تم صرف میری ذمہ داری ہو۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کے رکے بنا کہتے گئے۔

”ابھی شفیع اور سعیدہ اپنی خواہش لیے آئے تھے۔ تمھاری دادی کی تمنا ہے کہ تم اس گھر کی بہو بنو اور وہ تمھیں اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں۔ مجھے سلطانہ بیگم کی خواہش یا اس عمر میں ان کے مزاج اور تمھارے ساتھ سلوک کی اتنی فکر نہیں جتنی کبھی زہرہ کے لیے تھی۔ اس گھر میں شفیع اور سعیدہ کی سرپرستی میں تم محفوظ اور خوش رہو گی اس کا مجھے یقین ہے۔ شہود بھی اچھا بچہ ہے۔ میں اپنا فیصلہ نہیں سنا رہا ہوں۔۔۔ میں چاہتا ہوں خدانخواستہ مجھے کچھ ہو جائے اور یہ بات نکلے تو تمھیں میرے خیالات کا علم ہو تاکہ تمھیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔“

وہ دم بخود سی ان کی بات سن رہی تھی۔ وہ اتنی بے یقین اور متحیر تھی کہ کوئی رد عمل ہی نہیں تھا۔

”پریشان نہ ہو۔“ انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”بس تمھارے کان پر بات ڈالنا تھی سو ڈال دی۔ اب مجھے کوئی فکر نہیں۔“ اسے پھر وہم گھیرنے لگے۔

”ابھی آپ یہ سب نہ سوچیں اور سو جائیں صبح اسپتال جانا ہے۔“

”ہوں۔“ وہ تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئے۔

وہ اپنے بستر پر لیٹی تو پھر وہی ششدر سی کیفیت تھی لیکن جلد ہی نانا جان کی باتوں کی وجہ سے ستا رہے وہموں نے وہ بات بھلا دی۔ وہ دعائیں کرتی سو گئی۔

☆☆☆☆

اس بار سعیدہ نے اسے ہی فون کیا۔ انھوں نے اسے بی اماں یاد کر رہی ہیں کہنا نہ اس سے پوچھا بلکہ سیدھے اطلاع دی، کل شہود لینے آئے گا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ وہ نانا جان سے پہلے ہی اجازت لے چکی ہیں۔

وہ مکان اور کارڈ کی حقیقت اور نانا جان کی خواہش جاننے کے بعد اتنی جلدی اس کا سامنا کرنے ہرگز تیار نہ تھی۔ اب وہ اس سے بی اماں کو لے کر بحث بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ غلط اندازے، غلط ردعمل، غلط فیصلے، اتنے کم وقت میں وہ سب سے گزر گئی تھی۔

اس نے اروی کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔

”کل۔۔۔ کل ہی کیوں؟“ وہ ٹھٹکی۔

”پرسوں ٹیسٹ میں اچھے نمبر ضروری ہے ورنہ فائنل میں بڑا گندہ پوائنٹر بنے گا۔“ اس نے بے چارگی سے کہا۔

ویسے بھی نانا جان کو صرف شاکر کے بھروسے نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

اگلا دن چھٹی کا تھا تو سب کی موجودگی پہلے ہی اسے کوفت زدہ کر رہی تھی اور سب سے بھاری مرحلہ شہود کے ساتھ کار میں جانا تھا۔

”میں سو جاؤں گی یا سوتی بن جاؤں گی۔“ اس نے طے کیا۔

شہود، نانا جان کے ساتھ باتیں کرتا رہا اور آج بار بار اس کا دھیان بھٹک کے ادھر جا رہا تھا۔ پہلی بار وہ نانا جان کی اس میں دلچسپی اور پسندیدگی محسوس کر رہی تھی۔

”میں نے پہلے غور کیوں نہیں کیا؟“

اس دن وہ سو گئی تھی مگر آج نہ نیند آ رہی تھی نہ وہ سونے کا ڈرامہ کر پا رہی تھی۔ اس فراق میں عجیب حالت تھی جو اسے غصہ بھی دلا رہی تھی اور شرمندہ بھی کر رہی تھی۔

”تمھیں کوئی بات پریشان کر رہی ہے؟“ آخر اس نے پوچھ لیا۔

”کوئی بات؟ بہت سی باتیں!“ اس نے دل میں کہا اور سر نفی میں ہلایا۔ وہ اس کی سمت دیکھنے سے کترا رہی تھی۔

کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اس کا دماغ بھی چلنے لگا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ نانا جان نے جس گھر سے اسے دور رکھنے کی کوشش میں صعوبتیں برداشت کی تھیں اب اسے اسی گھر میں بھیج کر مطمئن ہو سکتے تھے۔ ایک ہی زندگی میں اتنے متضاد فیصلے، ایک ہی گھر میں اتنے متضاد مزاج لوگ۔

”شاید زندگی اور وقت کے سبق اسے ہی کہتے ہیں۔“ اور پھر اس کا ذہن خالہ پر آ کر رک گیا۔

”وہ تو یہ سننا بھی نہیں چاہیں گی۔“

آج بھی وہ دونوں اپنی سوچوں میں الجھے گاہے گاہے کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے گھر تک پہنچ گئے۔ آج پورچ خالی تھا۔

وہ پہلے بی اماں سے ملنے گئی۔ ان کی باتیں سنتے ہوئے غور سے ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے اسے خیال آیا۔

”اگر میں نے خالہ کی کوئی بات نہ سنی ہوتی تو کیا ان کے لیے میرے محسوسات الگ اور نرم ہوتے؟“

اگر اسے ان کا اور اپنی ماں کا ماضی نا معلوم ہوتا تو اس وقت وہ ایک ایسی بیمار، بستر سے لگی بوڑھی عورت تھی جو ہر وقت اپنے جواں مرگ بیٹے کی زندگی کو یاد کرتی رہتی تھی۔ اس کی باتیں کرتی اور کبھی خوش ہوتی، کبھی آبدیدہ تو کبھی نازاں۔ انجان لوگ تو بس اتنی محبت، اتنا دکھ دیکھ کر ہی متاثر ہو جائیں، اس بوڑھی عورت سے محبت کرنے لگیں، انھیں اس پر ناز ہو، وہ بوڑھی ’لیجنڈ‘ بن جائے، لوگ اس کے قصے سنانے لگیں۔ ایسا ہی تو ہوتا ہے۔ اکثر خوبصورت کہانیاں بے خبری کی دین ہوتی ہیں۔

لیکن ان کے متعلق اس کے جذبات نہ خالہ کی طرح شدید منفی تھے نہ وہ نانا جان کی طرح خود کو درگزر پر مائل پاتی تھی۔ اسے سعیدہ سے اپنائیت محسوس ہوتی تھی مگر اپنی دادی سے نہیں۔ جانے یہ واقعی خالص احساسات تھے یا نانا جان سے سعیدہ اور اس کی امی کی دوستی اور خیر خواہی کی سنی بات اور خالہ سے سنے دادی کے رویے کا اثر تھا۔

نیلوفر، ان کا کھانا لے کر آئیں تو ان کی باتیں رکیں۔

”تمھاری تو دوستی ہو گئی ہے بی اماں سے۔“ انھوں نے ٹرے رکھتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ خفیف سا مسکرا دی۔

”نیچے چلو سب کھانے بیٹھ رہے ہیں۔“ انھیں نرس ہی کھانا کھلاتی تھیں۔

”جاؤ تم بھی کھانا کھا لو پھر مجھے سب سے بات کرنی ہے۔“

اس وقت تو اس نے بی اماں کی بات کو اہمیت نہیں دی تھی مگر جب کھانے کے بعد ان کے حکم پر سارا گھر ان کے کمرے میں اکٹھا ہوا تو اسے بے چینی ہونے لگی۔ ایک تو اتنے لوگوں کی عادت نہیں تھی اور وہ بھی سب اجنبی۔ اس کی چھوٹی سی دنیا تھی اور وہی جانے پہچانے چند چہرے۔

جب سلطانہ بیگم نے بولنا شروع کیا تو اسی صحیح معنوں میں سمجھ آیا کہ وہ جب جوان و توانا تھیں تو کس قدر بارعب رہی ہوں گی۔ اتنے بڑے تایا اور چاچا بھی باادب سے انھیں سن رہے تھے۔ ان کی آواز میں اب بھی اپنی بات کے آخری اور حتمی ہونے کا یقین اور زعم تھا۔ اس کے والد کے جانے کا دکھ اور پھر اس کے ملنے کی خوشی میں اسے لگا وہ اپنے رویے پر پشیمانی کا اظہار کریں گی، اس کی امی کا ذکر ہو گا لیکن وہ یہ باب ’اسکپ‘ کر گئیں اور اس ساری تمہید کے بعد جو مدعا بیان کیا وہ سن کے اس نے ہڑبڑا کے پہلے انھیں اور پھر حاضرین کو دیکھا جن میں کچھ اسی کی طرح حیران تھے اور کچھ شاید پہلے ہی اس محفل کی وجہ جانتے تھے۔

اس گھر میں اس نے دو ہی لڑکے دیکھے تھے، شہود اور نادر اور سلطانہ بیگم نے ابھی ابھی کہا تھا ان کی خواہش ہے کہ شجاع کی بیٹی ہمیشہ اسی گھر میں رہے، بہو بن کے۔

”یہ بات میرے سامنے کہنے کی کیا ضرورت تھی، آپس میں کر لیتے۔ میں تھوڑی اس گھر کا حصہ ہوں اور میرے سرپرست بھی اس وقت میرے ساتھ نہیں۔“ وہ ان کی ان سنی کر کے اپنی سوچ جا رہی تھی۔ اسے نانا جان کی باتیں یاد آئیں، اسے شہود کا کارڈ آیا اور نانا جان کی فائلیں بھی۔

”میں قدسیہ کے نانا سے بات کروں اس سے پہلے مجھے تم دونوں کا جواب چاہیے۔ تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں؟“ وہ دونوں پوتوں کو دیکھ رہی تھیں۔ قدسیہ کو وہیں غصہ آ گیا۔ اس کی مرضی پہلے پوچھنا ضروری تھا۔ اس کے بعد اس سوال کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔

قدسیہ کے علاوہ باقی سارے ان کے اس سوال کو بخوبی سمجھتے تھے۔ یہ ان کا مخصوص انداز تھا۔ اب اگر ان دونوں کی مرضی اور پسند نہ بھی ہوتی تو انھوں نے حریف بنا دیے تھے۔ پہلا راؤنڈ چوں کہ شہود جیت چکا تھا اس لیے سب توقع کر رہے تھے اس وقت ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر نادر اپنا ہاتھ اونچا کر دے گا مگر شہود اس سے بھی زیادہ تیز رفتار ثابت ہوا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں بلکہ بڑا ہونے کے ناتے میں حاضر ہوں۔“

قدسیہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ حاضر ہے۔۔۔ کس کے لیے؟ قربانی کے لیے۔۔۔؟

اسے بہت ذلت محسوس ہوئی۔ وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

”مجھے گھر جانا ہے۔“

کہتے ہی اسے احساس ہوا کہ اس کا ڈرائیور شہود ہی تھا اور وہ فی الوقت اس کے ساتھ ہرگز نہیں جا سکتی تھی۔

”آؤ تم۔“ سعیدہ آگے آئیں۔ ان کی ساس کو زندگی اور وقت نے بہت سبق سکھائے تھے مگر کچھ چیزیں کبھی نہیں بدلتیں جیسے ابھی انھوں نے قدسیہ کی موجودگی اور مرضی دونوں یکسر فراموش کر دی تھی۔

”میں جلد آؤں گی تمھارے نانا سے کہنا۔“ بی اماں نے کہا اور وہ بمشکل خود کو کوئی ردعمل دینے سے روکتے ہوئی دروازے سے باہر نکل گئی۔ پہلی بار اسے ان پر غصہ آ رہا تھا۔ خالہ کی کہی بات کہ 'وہ اپنے علاوہ کسی کا نہیں سوچتیں۔' اسے درست لگ رہی تھی۔

ان دونوں کے پیچھے کوئی باہر نہیں نکلا۔

”بیٹھو۔ میں ابھی آئی۔“ سعیدہ اسے بٹھا کے اندر غائب ہو گئیں۔

”مجھے ان سے کہنا چاہیے تھا میں چلی جاؤں گی۔ میں کس کے انتظار میں یہاں بیٹھی ہوں۔۔۔ میں ہرگز ہرگز ان کے ساتھ واپس نہیں جاؤں گی۔“

اس نے سوچ لیا تھا وہ بس سے گھر جائے گی۔

کچھ دیر سعیدہ آئیں تو ساتھ شفیع احمد بھی تھے۔

"چلو بیٹا۔"

وہ دونوں اسے کار سے گھر چھوڑنے جا رہے تھے۔

کار میں سعیدہ نے اس سے کہا۔

"بیٹا بی اماں کا مزاج ایسا ہی ہے کہ وہ سب کو اچانک سرپرائز دیتی ہیں بنا کسی وارننگ کے۔ ہمیں تو عادت ہے لیکن تم۔۔۔ ان کی طرف سے میں معذرت کرتی ہوں۔"

"نہیں آنٹی آپ کیوں معذرت کر رہی ہیں۔۔۔" اس کا دماغ خراب تھا مگر سعیدہ نے جس سنجیدگی سے کہا اسے وہ بھی اچھا نہیں لگا کہ اتنے افراد میں اسے وہی اچھی لگتی تھیں۔

"مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا وہ تمھارے سامنے یہ بات چھیڑ دیں گی ورنہ کسی بہانے ٹال دیتی تمھیں نہ بلواتی۔" ان کا افسوس کم نہیں ہو رہا تھا۔

چند دن پہلے انھوں نے نادر یا شہود کا نام لیے بغیر اپنے بیٹوں سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ جب شفیع نے یہ بات بیگم سے کہی تو انھیں یہ خیال اچھا لگا۔ چند ملاقاتوں میں انھیں قدسیہ پسند آئی تھی۔ باقی بہوؤں کے مقابلے میں سعیدہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھیں اور روپے پیسے کی ریل پیل کے باوجود وہ فطرتاً اسی طبقے سے خود کو قریب محسوس کرتی تھیں۔

انھوں نے پہلا کام شہود سے اس کی مرضی پوچھنے کا کیا تھا جو یہ سن کر حیران رہ گیا تھا۔ اس کے مطابق دادای بس قدسیہ سے ملنا چاہتی تھیں اس سے تعلقات استوار رکھنے کی خواہش مند تھیں۔ اس نے انھیں کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"یہ اتنا سڈن سوال ہے مما۔۔۔ سوچنے دیں کچھ وقت۔"

اور اب اپنے جواب سے اس نے سب کے ساتھ انھیں بھی حیران کیا تھا۔

☆☆☆☆

وہ عجیب کیفیات میں گھری تھی جب ارویٰ دوڑتی اندر آئی۔

"یہ کیا سن رہی ہوں میں؟"

"کیا؟" اس نے غائب دماغی سے پوچھتے ہوئے کپ ٹرے میں رکھے۔

"تمھاری شادی کی بات ہو رہی ہے ادھر۔"

"ابھی ان فضول باتوں کا وقت ہے؟ یہ کیک کے پیسس کرو سلیقے سے۔" اس نے چاقو اور پلیٹ اس کی جانب کھسکا دی۔

”یعنی تمھیں سب معلوم ہے۔ ویسے ناناجان تو پورے راضی ہیں۔“

”ناناجان ٹریٹمنٹ نہ کرنے کے لیے بھی راضی تھے مگر ہم وہ کرتے ہیں جو ضروری ہوتا ہے۔“

”شادی سے ضروری تو کچھ بھی نہیں۔۔۔ اوہ یعنی تم بھی راضی ہو!“

”توبہ ہے ارویٰ!“ اس نے چڑ کر پلیٹ اپنی جانب کھینچی اور چاقو اس کے ہاتھ سے لیا۔

”جاؤ تم۔ میں کرلوں گی۔“

ارویٰ اپنی مسکراہٹ اور خوشی دباتی چلی گئی۔

شہود کا جملہ، ناناجان کی باتیں، دادی کا اعلان، سعیدہ کا رویہ اور ان سب پر حاوی خالہ۔۔۔ اس کے دل و دماغ پر اتنا بوجھ کبھی نہیں رہا تھا۔

کچھ دیر بعد شفیع احمد اور سعیدہ چلے گئے۔ وہ انتظار کرتی رہی کہ ناناجان اسے بلا کر اس کا حتمی فیصلہ پوچھیں گے۔ اس نے سوچ لیا تھا وہ ناناجان کو سمجھا کر، خالہ اور ماموں کی ناپسندیدگی بتا کر انھیں قائل کرلے گی کہ انھیں اس کے تایا اور تائی پر کتنا ہی بھروسہ کیوں نہ ہو، یہ فیصلہ درست نہیں۔

مگر ناناجان نے نہ اسے بلایا نہ یہ بات چھیڑی۔ وہ جس وقت باورچی خانے میں رات کا کھانا بنا رہی تھی، ناناجان شاکر کو اپنے کمرے میں لیے بیٹھے تھے۔ چھوٹا سہی مگر ان کے بعد گھر کا مرد وہی تھا۔

ان ساری نئی باتوں کے درمیان جو کارڈ اور ماموں ناناجان کی باتیں کہیں پیچھے چلی گئی تھیں، وہ بھی سامنے آن کھڑی ہوئیں اور اسے غصہ آنے لگا کہ اس دن دروازے پر ہی جھوٹ کیوں نہیں کہا کہ یہ زہرہ بانو کا گھر نہیں، وہیں بات ختم ہوجاتی مگر پھر ناناجان کے آپریشن کا بل یاد آجاتا۔

اب نہ رات کی نیند رہی تھی نہ دن کا سکون۔ مختلف مزاج، مختلف ماضی، مختلف خیالات والے سارے رشتوں کو اسے سنبھالنا تھا۔ ناناجان، جو اس وقت سلطانہ بیگم یا ماضی کے سب سے زیادہ ستائے ہوئے تھے، انھوں نے درگزر اور آگے بڑھ جانے کو چنا تھا۔ خالہ وہیں کھڑی تھیں۔ دادی، لوگ کہہ رہے تھے، بدل گئی ہیں۔ جو ان کے عتاب کا نشانہ تھیں وہ اب نہیں تھیں مگر وہ ان ہی کے وجود کا حصہ تھی تو کیا وہ ماں کا بدلہ نہ لے؟ ماں کے قصوروار کو ایک بار پھر جیت جانے دے؟ اپنے ناناجان کا طریق اپنائے یا دنیا کا؟ خالہ کو اتنا بڑا صدمہ کیسے دے؟ اور جب یہ سب سوچ لیتی تو ایک دم اٹھ بیٹھتی کہ وہ یہ سوچ بھی کیوں رہی ہے، یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ جتنی شدت سے انکار کرتی شہود اتنی ہی فراغت سے اس کی سوچوں میں آبیٹھتا۔

☆☆☆☆

ناناجان کو جس دن اسپتال میں داخل ہونا تھا اس سے دو دن پہلے وہ ان تینوں کو لیے بیٹھے تھے۔ وہ انھیں سمجھا رہے تھے کہ خدانخواستہ دوران سرجری انھیں کچھ ہوگیا تو ان تینوں کو کیا کرنا ہے، کیسے کرنا ہے، کس پر بھروسہ کرنا ہے۔ انھوں نے اپنے بینک کی تفصیل، بچت کھاتے کا پاس

بک، گھر کے کاغذات سب کچھ سامنے رکھ کے سمجھایا۔ پہلی بار جاتے ہوئے انھوں نے ایسا کیا تھا اور اب وہ جتنے عام انداز میں انھیں سب سمجھا رہے تھے، ان تینوں کے دل ڈوبے جا رہے تھے۔ جب بھی انھوں نے کچھ کہنے منہ کھولا، نانا جان نے رسان سے انھیں چپ کرا دیا کہ مجھے کہنے دو اب میری عمر ہو گئی ہے یہ تم تینوں کی ذمہ داریاں ہیں جو مجھے بہت پہلے تمھیں سونپ دینی چاہیے تھیں۔

جب میز کے سارے کاغذات ایک طرف ہو گئے تو قدسیہ نے کچھ بولنا چاہا کہ انھوں نے روکا۔

”ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی ہے۔“

”کچھ اشارے اوپر والے کی جانب سے ہوتے ہیں۔ مناسب وقت پر بچھڑوں کا مل جانا، اچھے لوگوں کا دوبارہ زندگی میں آ جانا۔ سلطانہ بیگم کے پاس کبھی بے پناہ طاقت اور غرور تھا مگر آج وہ بے بس ہیں۔ جانے انھیں غلطیوں کا احساس ہیں یا یہ محض آخری عمر کا جھٹپٹا ہے مگر ان کی قدسی کی تلاش کی کوشش نے ایک نیا امکان پیدا کیا ہے۔ کل شجاع اور سعیدہ نے شہود کے لیے باقاعدہ رشتہ دیا ہے اور میں قدسی کی مرضی جاننا چاہتا ہوں۔۔۔“

”نانا جان یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔۔۔“

”وقت کے ماتھے پر کب لکھا ہوتا ہے بیٹا، یہ تو ہمیں طے کرنا ہوتا ہے کہ فلاں بات کا یہ ہی وقت ہے۔ تم جو فیصلہ کرو میں وہ ان سے کہہ دوں تو مطمئن ہو جاؤں۔“ وہ غلطی سے بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ نانا جان اس طرح اسے بلیک میل کر رہے ہیں۔ وہ سادگی میں اس سے اپنی توقع اور ان کی خوش بیان کر گئے تھے۔ وہ انکار کر دیتی تو انھیں افسوس ہوتا مگر وہ اصرار نہ کرتے۔

”دنیا کیا سوچتی ہے، لوگ کیا کہیں گے اور طاہرہ کا غصہ۔۔۔ یہ سب نہ سوچو۔۔۔ اس گھر کے لوگ اور شہود تمھیں پسند ہے یا نہیں، اس بنیاد پر فیصلہ کرو۔“

اس نے ارویٰ اور شاکر کو دیکھا جو اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر لکھا تھا، ہاں کہہ دو۔

وہ کچھ کہتی اس سے پہلے اطلاعی گھنٹی بجی۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ ارویٰ اٹھی۔

نانا جان اسے پر امید نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ جیسے سارے معاملات طے کرنے کے بعد اوٹی میں جانا چاہتے تھے۔ انھیں اپنے بعد ان تینوں کی اور خاص طور پر اس کی زندگی میں خوشی اور اطمینان کی ضمانت چاہیے تھی۔ وہ کیسے انھیں بے چین اور فکر مند رہنے دے سکتی تھی۔ بس کچھ دن کی بات تھی۔ پھر وہ فرصت سے اپنا دل اور جذبات ٹٹول کر صحیح فیصلہ کر کے انھیں منا سکتی تھی تاہم اس وقت ان کا مطمئن ہونا ضروری تھا۔

”جو آپ کا فیصلہ نانا جان، وہ ہی میرا فیصلہ ہو گا۔“ اور اس نے انھیں سکون تھما دیا۔

اس کے فرشتے بھی نہیں جانتے تھے کچھ پل بعد اس کا یہ جملہ کیا گل کھلانے والا ہے۔

باہر سلطانہ بیگم خود موجود تھیں۔ وہ جن کا بستر سے اترنا ہی مشکل تھا وہ خود چل کر نانا جان سے ان کی نواسی کا ہاتھ مانگنے آئی تھیں۔ انھوں نے معافی نہیں مانگی تھی مگر نانا جان جیسے افراد الفاظ سے زیادہ احساس سمجھتے ہیں۔ نانا جان کے لیے ان کا اس در تک آنا ان کی پچھتاوے کی دلیل تھا۔

”جو ہوا اس کا افسوس ہے۔ بیٹے کی محبت نے صحیح سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لی تھی مگر اب بھی میں اپنے بیٹے کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔
“

اور سب کچھ یوں اناً فاناً ہوا کہ وہ بھونچکی رہ گئی۔ بی اماں کے ساتھ شفیع احمد، سعیدہ اور رفیق احمد نیلوفر تھے۔ مگر نانا جان کی خواہش سنتے ہی زلزلہ آ گیا۔ شہود کو فون کر کے بلایا گیا تو اس کے ساتھ عارضہ اور بانو بھی تھیں۔

شاکر اور اروٰی نے اس کی ایک نہ سنی۔ اسے کیا معلوم تھا دادی رستے میں ہے ورنہ وہ نانا جان سے جو آپ کا فیصلہ وہ میرا فیصلہ والا جملہ کبھی نہ کہتی۔ وہ کہتی ہی رہ گئی خالہ کا کیا؟ انھیں کون بتائے گا؟ وہ کتنا غصہ ہوں گی کوئی سوچو تو۔۔۔ اس کا دل کیا ایک بار نانا جان سے کہے سوچیں اگر یہ بھی میری دادی کی سازش ہوئی تو۔۔۔ وہ اس طرح آپ کو شکست دینا چاہ رہی ہو تو۔۔۔ مگر کچھ دیر بعد اس کا شہود کے ساتھ نکاح پڑھا دیا گیا۔ نانا جان کو ویسے بھی شہود کے ماں باپ پر زیادہ بھروسہ تھا۔

یہ نانا جان کی خواہش تھی کہ کیا پتا اسپتال میں میری آنکھ کھلے نہ کھلے لہذا کھلی آنکھوں سے میں یہ دیکھ لوں۔

وہ آئینے کے سامنے بیٹھی۔ آنکھیں پھاڑے خود کو دیکھ رہی تھی۔

”جاگ قدسیہ جاگ!“ اس نے اپنے گالوں پر ہاتھ مارے پھر گال پر خود چٹکی لی۔

”آہ!“ اس نے چہرہ ہاتھوں پر گرا لیا۔

”کیا کر لیا یہ!“

اس کی گھوریوں کا اثر تھا کہ شاکر اور اروٰی خوش ہونے کے باوجود اسے چھیڑنے کی ہمت نہیں کر سکے تھے۔ شہود کو اس نے دیکھا نہیں تھا۔ دادی، سعیدہ، نیلوفر سب اس سے مل کر گئے تھے۔

”خالہ!“ وہ ایک دم سر اٹھا کے سیدھی ہوئی۔

سوچ کر ہی اس کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ جو شہود دل و دماغ پر چھانے لگا تھا یک لخت اس کی جگہ خالہ نے لے لی۔

"میں خواب دیکھ رہی ہوں۔" جب دماغ مفلوج ہونے لگا تو وہ بستر پر گر گئی۔

☆☆☆☆

وہ تینوں ایک بار پھر اروٰی کے باہر انتظار گاہ میں موجود تھے۔ اس بار دعاؤں میں شدت اور تڑپ پہلے سے زیادہ تھی۔ اس بار خالہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔ سرد سی کرسی پر نظر جھکائے بیٹھے بیٹھے جب وہ سیدھی ہوئی تو اندر داخل ہو رہے شہود کو دیکھ کر بے اختیار نظر خالہ کی سمت اٹھی جو اروٰی سے بات کر رہی تھی۔ وہ کھڑی ہو گئی کہ اسے باہر بھیج سکے مگر اس سے پہلے ہی شاکر نے دیکھ لیا۔

”شہود بھائی!“ اس کی آواز دھیمی تھی مگر اس سناٹے میں سب نے سن لی۔ وہ واپس سر جھکا کے بیٹھ گئی کہ بہتر تھا اب اگلے مراحل اروٰی اور شاکر ہی بھگتیں۔ اس نے پھر نظر نہیں اٹھائی کہ سامنے کیا ہو رہا ہے۔ اسے نانا جان اور ماموں کی باتیں بھی یاد آ گئی تھیں اور اپنے پرس میں پڑا کارڈ بھی اور اپنا قبول ہے بھی۔

”اف خالہ ابھی تو اصل دھماکا باقی ہے!“ وہ جو صرف اس کی موجودگی پر اس قدر نالاں تھیں، ان دونوں کے رشتے کا سن کر آگ بگولہ کیا انھوں نے زندہ آتش فشاں بن جانا تھا۔

شہود اس کے بازو والی کرسی پر بیٹھا تو اس نے سر اٹھا کے کمرے کو دیکھا وہاں وہ تینوں نہیں ہیں۔

”یہ سب کہاں گئے؟“

”کیفے، چائے پینے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

یقیناً خالہ کو شانت کرنے لے گئے ہوں گے دونوں۔

ایک نئے رشتے میں یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔

”ڈونٹ وری نانا جان جانا مکمل صحت یاب ہو جائیں گے ان شاء اللہ۔“ شہود کا جملہ رسمی تھا مگر دھیمی آواز اور لہجے میں سچائی اور امید تھی۔ اس نے سر اٹھا کے دیکھا۔

اب جانے کس کی نظر بدلی تھی، شہود کی یا اس کی اپنی۔ شہود نے نظر نہیں ہٹائی یہاں تک کہ اس نے سر جھکا لیا مگر اس میں حیا یا جھجک نہیں تھی بلکہ وہ اس سے غصہ تھی اور نئے رشتے کو اہمیت دینا نہیں چاہتی تھی مگر اسے اس پل احساس ہوا تھا کہ یہ ممکن نہیں۔ ان کے مابین اب کچھ نیا تھا۔

”تمھاری خالہ کو کیسے منایا جا سکتا ہے؟“ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔ اس نے نکاح کا ذکر کیے بنا اسے اہمیت دی تھی کہ اگلا مرحلہ اعلان اور سب کی قبولیت ہی تھا۔

”آپ سوچیے بھی مت۔“ اس نے جھٹ کہا۔

”ابھی انھیں کچھ علم نہیں ہے۔“ اسے لگا کہیں وہ اسی وقت انھیں منانے نہ چل پڑے۔

”کیا علم نہیں ہے؟“

”وہی جو ہمارے بڑوں نے آناً فاناً کر دیا ہے۔“ اس نے چڑ کے کہا۔

”تمھیں صرف اناً فاناً کا ہی افسوس ہے نا؟“

”مجھے اس وقت صرف نانا جان کے کام یاب آپریشن کی فکر ہے، دوسرا کوئی خیال نہیں ہے۔“ اس سے پہلے کہ اسے شہود کا میں قربانی کے لیے تیار ہوں یاد آتا، یکایک کارڈ یاد آگیا۔ وہ پھر اسے دیکھنے لگی۔ احساس بدل گئے تھے۔ جانے انجانے جو بھی تھا اس کی وجہ سے نانا جان کا علاج ممکن ہوا تھا اور یہ اس کے لیے بہت اہم تھا۔

”کیا؟“ جب بڑی دیر تک بولی نہیں تو شہود نے پوچھا۔

”آپ جانتے تھے امی اور مجھے جو ملنا تھا، مل چکا تھا؟“

”نہیں۔“ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

”تمھیں کارڈ دینے کے بعد مما سے سرسری پوچھا تھا۔“

وہ شرمندگی کے احساس سے مغلوب اپنی بات کہنے کے لیے الفاظ تول رہی تھی۔ ابھی کہنا شروع ہی کیا تھا کہ شہود نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

”اٹس اوکے۔ تمھیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان فیکٹ مجھے تمھاری اس اسمارٹنیس نے امپریس کیا تھا۔“ وہ اپنے ہاتھ پر اس کے لمس پر ہی دم سادھے تھی کہ اس کی آخری بات پر پھر چونک کے اسے دیکھا۔ شہود مسکرایا۔

”تمھارے اور میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور کسی تیسرے کا جاننا ضروری بھی نہیں ہے۔“

قدسیہ نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے کھینچا۔

”سوری۔“ اسے اپنی بے اختیاری کا احساس ہوا۔

”خالہ کے آنے سے پہلے آپ چلے جائیں۔“ جس طرح دونوں کے ہی انداز بدلے تھے، خالہ کی چھٹی حس انھیں ضرور آگاہ کر دیتی۔

”مجھے مما اور بی اماں نے کہا تھا کہ آپریشن ہونے تک رکوں۔“ اب جانے یہ سچ تھا یا بہانہ۔ قدسیہ نے شاکی نظریں اٹھائیں اور وہ جانے کیا سمجھا۔

”نہیں۔۔۔ مطلب آنا تو میں بھی چاہتا تھا۔۔۔“

”آپ پلیز اس وقت جائیں۔ آپ خالہ کو نہیں جانتے۔“ اسے اس وقت نیا تماشہ نہیں چاہیے تھا۔

”مجھے تم سے بات بلکہ باتیں کرنی تھیں اور۔۔۔“

”پھر کبھی۔۔۔ میں آنٹی سے کہہ دوں گی کہ میں نے جانے کہا تھا۔“ اس کی نظریں اب دروازے پر ہی تھیں۔ وہ کھڑا ہو گیا۔

”پھر کبھی۔۔۔ تم بھولنا نہیں۔“ جانے سے پہلے اس نے کہا تھا۔

اس بار نانا جان کی سرجری مکمل کام یاب رہی تھی۔ اروی اور شاکر نے کیا پٹی پڑھائی تھی کہ خالہ نے دوبارہ شہود کا اس سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔

سعیدہ اور شفیع احمد کے علاوہ بھی سب نانا جان سے ملنے آئے تھے۔ بی اماں بھی فون پر نانا جان کا احوال پوچھتی رہی تھیں۔

اس بار اسپتال میں ان کا قیام ایک ہفتے سے زیادہ رہا۔ ماموں ایک دفعہ بھی اسپتال ملنے نہیں آئے۔

نانا جان کے گھر آنے کے بعد وہ ان کی دیکھ بھال میں ہی بے حد مصروف رہی۔ شاکر اور اروٰی کے بھی امتحان تھے، اسے اکیلے ہی سب دیکھنا پڑ رہا تھا۔ جب ان کے امتحان ختم ہوئے تو اسے کچھ راحت ملی۔ سعیدہ نانا جان سے ملنے آئی تھیں۔

”آپ اب قدسیہ کو چند دن کے لیے بھیجیے گا ہماری طرف، اسے بھی تبدیلی کی ضرورت ہے، اتنے دن سے آپ کی تیمارداری کر رہی ہے تھک گئی ہو گی۔۔۔“ جاتے وقت سعیدہ نے کہا تھا اور کچھ دن بعد انھوں نے شہود کو بھیج بھی دیا۔

اس سے زیادہ پرجوش اروٰی تھی جس نے اس کا بیگ تیار کیا تھا۔

”ارے تم کیا کیا ٹھونس رہی ہو میں بس ایک دن رکوں گی!“ نانا جان کو بھی سعیدہ کی بات درست لگی تھی کہ اسے تبدیلی کی ضرورت ہے لہٰذا وہ اسے چند دنوں کے بھیج رہے تھے۔

”ہاں تو اب تمھارا سسرال ہے وہ۔۔۔ تمھیں تو شہود بھائی کا فیورٹ کلر بھی نہیں پتا اس لیے۔۔۔“

”میری اماں!“ قدسیہ نے بیگ اس کے پاس سے کھینچا۔

”میں تمھارے ناول کی ہیروئین نہیں ہوں۔ دل نہیں لگا تو کل ہی واپس آجاؤں گی۔“

”دل کیسے نہیں لگے گا۔۔۔ سسرال ہے اب وہ تمھارا۔۔۔ اب تمھیں۔۔۔“

”آ۔۔۔ آ۔۔۔!“ وہ بیگ کان پر رکھتی باہر نکل گئی۔

☆☆☆☆

”آپ کے کام کا ہرج نہیں ہوتا؟“ کار ذرا آگے بڑھی تو قدسیہ نے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ اس کے سوال کا مقصد سمجھ گیا تھا۔

”ویسے اب تو یہ میری پرمننٹ ڈیوٹی ہو جائے گی۔“

وہ اسے دیکھ کے مسکرایا اور وہ بلا سوچے سمجھے پہلے کی طرح بول دینے پر پچھتائی۔

اسے بھی شہود سے بہت سی باتیں پوچھنا تھیں۔ وہ کیوں اس اچانک نکاح کے لیے تیار ہو گیا تھا جب کہ وہاں دوسرا شخص بھی موجود تھا۔ وہ مجبور تو نہیں تھا۔ وہ نہ بڑی حسین تھی نہ امیر تھی، نہ بہت پڑھی لکھی۔ عام سی صورت، عام سا گھرانہ اور عام سا گریجویشن۔

"آپ نے کیوں کہا تھا کہ آپ تیار ہے؟ یوں جیسے کوئی قربانی کے لیے خود کو پیش کر رہے ہیں۔۔۔" اس کا سوال ہی نہیں لہجہ بھی چونکانے والا تھا۔

شہود کو بھی 'پھر کبھی' یاد تھا مگر برا ہوا کہ کام سے متعلق اس کا 'نہیں' کسے برا لگ گیا کہ ایک ضروری فون کال نپٹاتے ہوئے ان کا پورا راستہ طے ہو گیا۔

”سوری تم بور ہوتی رہیں۔“ گیٹ کے اندر داخل ہوتے وقت اس نے کہا تھا۔ اسے اپنے سوال کا جواب نہیں ملا تھا اور اسے شک ہوا کہ وہ جواب ٹال رہا ہے۔

گھر میں چوں کہ بہ حیثیت بہو یا شہود کی منکوحہ یہ پہلی آمد تھی لہٰذا اس کے لیے بڑا اہتمام کیا گیا تھا۔ سب گھر میں موجود تھے اور اس بار بی اماں کے کمرے کی بجائے سب ڈرائنگ روم میں تھے۔ بی اماں بھی اپنی وہیل چیئر پر وہیں تھیں۔

سب کا تفصیلی تعارف ایک بار پھر مزید تفصیل سے ہوا۔ رات کا کھانا باہر سے منگوایا گیا تھا جو فاسٹ فوڈ پر مشتمل تھا۔ اسے ان سب کی امید نہیں تھی اور اسے یہ اچھا بھی نہیں لگ رہا تھا۔ مانو سب کچھ اور ہر کوئی اس پر نیا تعلق لاد رہا تھا۔

پہلی بار نادر بھی سارا وقت موجود تھا اور وہ شہود اور اس کے درمیان ٹانگیں کھینچنے کا مقابلہ دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں اسے بے آرام کر رہی تھی۔ باقی سب اس کے عادی محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے ایک دو بار ان کے نئے نویلے رشتے پر طنز بھی کیا جسے سب نے نظر انداز کیا۔ ہاں بی اماں کا رویہ دونوں کے ساتھ یکساں مشفقانہ تھا۔

پزا کھاتے ہوئے اسے پانی کی ضرورت تھی اور میز کے درمیان رکھے کولڈ ڈرنکس اور پانی کی بوتلیں تھیں۔ حالیہ تاریخ کے مدنظر، بند بوتلیں دیکھ کر اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ کوئی بوتل اٹھائے۔ مگر کب تک پیاسی رہتی۔ آخر ہمت کر کے اس نے ایک بوتل اٹھائی۔ شکر تھا وہ کھلی تھی۔

”سب لان میں جا رہے ہیں آپی آپ بھی آئیں۔“ عراضہ نے کہا تو وہ پلیٹ میز پر رکھ کے جانے لگی تھی کہ نظر پھر بوتلوں پر پڑی اور ذہن میں آئے خیال پر اس نے باری باری پانی کی بوتلوں کے ڈھکن گھما کے دیکھے۔ سارے کھلے تھے۔ جانے کتنے عرصے بعد اس کے ہونٹوں پر بڑا دلکش اور جاندار تبسم ٹھہر گیا۔ اسے ضرورت نہیں تھی پھر بھی اس نے ایک بوتل اٹھالی۔

وہ تو خاموش سامع تھی مگر وہ سب اس طرح کے ہنگامے اور عشائیے کے عادی لگ رہے تھے۔ بڑی دیر بعد سب اندر آئے۔ بڑے ٹی وی لگا کر بیٹھ گئے اور باقی فون میں سر دیے مگن تھے۔

سعیدہ اسے اس کا کمرہ بتا چکی تھیں۔ وہ نماز پڑھ کے پانی کے لیے باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی۔

وہ اپنی دھن میں چلی جا رہی تھی کہ کوئی سامنے آیا، وہ ایک طرف ہو گئی۔ وہ بھی اس طرف ہو گیا، وہ دوسری طرف کھسکی، سامنے والا بھی اس کے ساتھ اسی طرف آیا۔ اس نے غصے میں سر اٹھایا۔ سامنے نادر تھا۔

”کبھی دو منٹ رک کے بات بھی کر لیا کریں، ہم بھی کزن ہیں آپ کے۔“ اس کی خباثت اسے پہلے کبھی اتنی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

”آپ نے موقع نہیں دیا ورنہ کزن سے زیادہ ہوتے۔۔۔“ قدسیہ کو چہرہ سرخ ہو گیا۔

”ویسے آپ اب بھی موقع دے سکتی ہیں۔۔۔“ وہ ایک قدم آگے آیا اور قدسیہ پیچھے ہٹی۔ چہرے پر بے یقینی اور حیرت پھیلی کہ اس کی نظر نادر کے شانے کے اوپر سے دکھائی دے رہے شہود پر پڑی جو سینے پر ہاتھ باندھے اطمینان سے کھڑا تھا۔

”آپ خوش نہیں ہیں مجھے دکھائی دیتا ہے کوئی اور نہ سمجھے مگر میں سمجھتا ہوں۔۔۔ ہم دونوں مل کے اس پیپر ہزبنڈ کو سبق سکھاتے ہیں۔۔۔“ قدسیہ پھر پیچھے ہوئی۔ وہ نہ صرف آگے آیا بلکہ اس دفعہ ہاتھ اٹھا کر گردن پر جھول رہی لٹ چھونا چاہی۔ قدسیہ بدک کے پیچھے ہوئی اب اسے غصہ نادر سے زیادہ پیچھے تماشہ دیکھ رہے شہود پر آ رہا تھا۔

”تمھیں اس کے لیے وقف ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔“ اس نے دوسرا ہاتھ بھی اٹھایا اور قدسیہ کا صبر جواب دے گیا۔

”میں ہاتھ اٹھاؤں یا۔۔۔“ وہ شہود سے کہہ رہی تھی اور وہ اسی کا منتظر تھا۔ اس کا جملہ ادھورا تھا۔

نادر کچھ سمجھ پاتا اس سے پہلے شہود نے اس کا رخ اپنی جانب کیا اور پہلا گھونسا ناک پر مارا۔ وہ تلملایا اور ناک پکڑ کے رہ گیا۔ سنبھل کے وار کرنے لگا ہی تھا کہ شہود نے یکے بعد دیگر تین گھونسے اس زور سے مارے کے چوتھا گھونسہ اسے لگانے کی بجائے اپنا ہاتھ جھٹکنے لگا۔

قدسیہ نے اس کی سرخ اور نادر کے خون سے اٹی انگلیاں دیکھیں جو جھٹکتے ہوئے وہ مٹھی کھول اور بند کر رہا تھا۔

نادر منہ پر ہاتھ رکھے جانے کیا کہہ رہا تھا۔ اس کے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ ابھی سارا گھر اکٹھا ہو جانا تھا۔

قدسیہ نے باری باری دونوں پر نظر ڈالی اور یکایک شہود کا دوسرا ہاتھ پکڑ کے اسے کھینچ کے آگے بڑھی۔ سامنے جو دروازہ تھا وہ وہیں داخل ہو گئی۔ وہ باورچی خانہ تھا۔ وہ سنک کے پاس آ کر رکی اور اس کا ہاتھ چھوڑ کے زخمی ہاتھ کلائی سے پکڑ کے سنک کے نلکے کے نیچے کیا۔

”اتنی بکواس سننے سے پہلے نہیں دو لگا سکتے تھے۔“ نلکے سے پانی کھولتے ہوئے اس کی نظر ہاتھ پر ہی تھی اور غصہ اب بھی قائم تھا۔

”یہ میں کہتا تو تمھیں قیامت تک سمجھ نہیں آنا تھا کہ۔۔۔“ وہ غلط نہیں تھا۔

”اگر میں نے اس وقت ہاں نہ کی ہوتی تو وہ۔۔۔“ وہ چپ ہو گیا۔

قدسیہ اس کے بہ عجلت کہے ”مجھے کوئی اعتراض نہیں بلکہ بڑا ہونے کے ناتے میں حاضر ہوں۔“ کا مطلب اور وجہ اب خوب جان گئی تھی۔ اس نے کب نادر کا اصل چہرہ دیکھا تھا یا کسی نے بتایا تھا۔ نانا جان بھی اس کی طرح انجان ہی تھے۔ اگر سلطانہ بیگم اس پوتے کا کہتیں تو؟ اس کا دل غوطے کھانے لگا۔

شہود کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے نلکا بند کیا اور اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ اس کے ہاتھ سے پانی ٹپک کر فرش پر گر رہا تھا جو قدسیہ کی صاف صفائی کا خبط رکھنے والے مزاج پر گراں گزر رہا تھا۔ اس کی شکن زدہ پیشانی اور غصے سے ناک ابھی تک سرخ تھی۔

ہاتھ سے ٹپکتی بوندوں کو دیکھتے ہوئے اس نے پھر بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے دوپٹے سے خشک کرنے لگی۔

”فرش گیلا ہو رہا ہے۔“ شہود نے اس دفعہ اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ محسوس کیا۔

اس سے پہلے تو گھونسے مارنے کے بعد اس کی انگلیاں بھی درد سے بلبلا رہی تھیں کہ اس نے اتنی قوت سے مارا تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے پانی خشک کر رہی تھی۔ جب اس نے ہاتھ سیدھا کر کے ہتھیلی پر دوپٹا پھیرا تو شہود نے بمشکل ہتھیلی بند کرنے سے خود کو روکا۔

”اس پر کچھ لگائیں اور۔۔۔“ اس نے آہستہ سے ہاتھ چھوڑ دیا۔

”آئندہ یوں کھڑے کھڑے تماشہ دیکھا تو پھر میں نادر کا جو حال کروں گی اس کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔ اس کی اماں کو جواب دیجیے گا آپ ہی۔“

”میں کیوں نادر کو کچھ کہوں یا کروں؟“

”ابھی کیوں کیا؟“ جیسے اس نے بے ساختہ پوچھا تھا ویسے ہی بے اختیار قدسیہ بھی پوچھ بیٹھی۔

”میرا جواب تمھیں اچھا نہیں لگے گا۔“

”بیوی یا منکوحہ ہی کیوں، ایسی بدتمیزی کسی بھی لڑکی سے ہو رہی ہو، آپ نے اگلے کو پیٹ دینا چاہیے۔“ اسے خیال ہی نہیں تھا وہ کیا کہہ گئی ہے۔

”میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تم بیوی ہو اس وجہ سے مارا ہے۔۔۔“ قدسیہ کا دل کیا غائب ہو جائے۔

وہ میدان چھوڑ کے جانے پلٹی ہی تھی کہ شہود نے اس کا بازو پکڑ کے روکا۔

”ایک تو یہ بڑی بری عادت ہے تمھاری۔۔۔“ اس نے قدسیہ کا رخ اپنی طرف کیا۔

”کیا کیا تم نے۔۔۔“ گھبرائی بوکھلائی سعیدہ دروازے میں نمودار ہوئیں۔ شہود نے اس کا بازو آزاد کیا۔ وہ تیزی سے ان دونوں کے قریب آئیں۔

”نادر نے گھر سر پر اٹھا لیا ہے اور۔۔۔“ ان کی نظر بیٹے کے ہاتھ پر پڑی۔

”یاالٰہی!“ انھوں نے اس کا ہاتھ دیکھا پھر قدسیہ کو۔ انھیں سارا ماجرا سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔

”تم نے مارا ہے۔ اسے لے جاؤں کمرے میں کچھ مرہم لگاؤ۔۔۔ بلکہ دونوں میرے ساتھ آؤ۔“ پہلے اسے کہا پھر خود شہود کو کھینچتی تیزی سے آگے بڑھیں۔

”تم بھی آؤ قدسیہ۔“ انھوں نے اسے پکارا۔ وہ بھی ساتھ ہو لی۔

سب سے پہلا کمرہ ان کا ہی تھا۔ دونوں کو اندر بھیج کے وہ دروازے میں رک گئیں۔

"جب تک میں واپس نہ آؤں یہاں سے باہر مت نکلنا۔ واش روم میں میڈیسن باکس ہے۔" انھوں نے قدسیہ سے کہا اور دروازہ بند کر کے چلی گئیں۔

نادر چپ بیٹھنے والا نہیں تھا اور اس وقت شہود کو بھی اس معاملے میں اس کے سامنے لانا گھر میں ایک نئے طوفان کو دعوت ہوتی۔ مشترکہ خاندانی نظام امیروں کا ہو یا متوسط طبقے کا، مسائل ایک سے ہوتے ہیں، حل بھی۔ وہ اسے چیخنے چلانے کا موقع دے کر بات بڑھنے سے روک رہی تھیں۔ اس کی نکسیر پھوٹ گئی تھی اور اس وقت سب ہی اسے گھیرے تھے۔ وہ تکلیف اور جھنجھلاہٹ کی وجہ سے پاگل ہو رہا تھا۔ قدسیہ غسل خانے سے ڈبہ اٹھا لائی تھی۔

"بیٹھیں۔" اس نے کہا۔

"کچھ نہیں ہو گا۔ مما یونہی پریشان ہو رہی تھیں۔ یہ رکھ دو واپس۔" قدسیہ ڈبہ لیے کھڑی رہی مانو زخم پر مرہم لگا کے ہی ہٹے گی۔

"کیا کرو گی تم؟" شہود نے ہاتھ سامنے کیا۔

"کوئی وونڈ نہیں ہے اور تمھارا آئنٹمنٹ یہاں وہاں لگ کے میرے کپڑے، بیڈ، دیواریں، چیزیں سب خراب کرے گا۔ وہ ان کی مدرلی انکسٹنٹ تھیں تم رہنے دو۔ کہہ دینا لگا دیا تھا۔" وہ ذرا ٹھہرا اور پھر مسکراتا پاس آیا۔

"ہاں اگر تمھاری بھی۔۔۔"

"میری کوئی انکسٹنٹ نہیں جاگی ہے۔" اس نے تڑخ کے کہا اور جس انداز میں شہود نے شانے اچکا کے منہ بنایا اس کا مطلب تھا۔

"میں نے تو تمھاری انکسٹنٹ نہیں کہا!" وہ اپنی جلد بازی پر کڑھتی واپس غسل خانے کی سمت چلی گئی۔

"کب تک بند رہیں گے یہاں۔" واپس آتے ہی اس نے پوچھا۔ وہ سعیدہ اور شفیع کی خواب گاہ میں تھے۔

شہود نے آگے جا کر دروازہ کھولنا چاہا اور دو تین کوشش کے بعد پلٹ کے اسے دیکھا۔

"مما باہر سے لاک کر کے گئی ہیں۔" وہ سکون سے مسہری پر آ کر بیٹھ گیا۔

قدسیہ کو گویا یقین نہیں آیا اس نے خود جا کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ شہود ریموٹ اٹھا کے ٹی وی لگا چکا تھا۔

"ریلیکس کرو۔ جب تک باہر سکون نہیں ہوتا مما نے دروازہ نہیں کھولنا۔"

"آپ پہلے بھی یہ کر چکے ہیں؟ یعنی مار پیٹ معمول ہے آپ کا۔" شہود نے اسے دیکھا۔

"کچھ دیر پہلے تم ہی کہہ رہی تھیں کہ اگلے کو پیٹ دینا چاہیے۔۔۔" اسے بھی جیسے یاد آ گیا سو چپ ہو گئی۔

کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے وہ مسلسل ٹہل رہی تھی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ آخر شہود سے رہا نہیں گیا۔ وہ بیٹھ گئی۔ شکر تھا اسے گھر نہیں جانا تھا۔ وہاں وہ اس کے منتظر نہیں تھے۔ اسے اب نیند آرہی تھی۔ کچھ دیر فون دیکھنے کے بعد اس نے فون رکھ دیا۔

”آپ آنٹی کو فون تو کریں۔“ اس نے شہود سے کہا۔

”ٹرائی کیا۔ وہ اٹھا نہیں رہی ہیں۔“ شہود کے جواب پر اس نے جمائی روکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔

”تم ادھر لیٹ جاؤ۔“ وہ ٹی وی بند کرتا کھڑا ہو گیا۔

وہ مروت اور تکلف دکھانے کی بجائے اٹھ گئی۔ شہود صوفے پر بیٹھ گیا اور وہ مسہری پر۔

اسے پتا ہی نہیں چلا کب وہ بستر پر لیٹی اور سو گئی۔ شہود نے فون بند کر کے دیکھا تو وہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس وقت ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ نیند اسے بھی آرہی تھی۔ سعیدہ اب بھی نہ فون اٹھا رہی تھیں نہ اس کے پیغام دیکھے تھے۔ وہ اٹھ کے مسہری کے پاس آیا۔ قدسیہ گٹھڑی بنی سوئی تھی۔ اس کا دل کیا، اس کے گال چھو کے اسے اٹھائے اور جو باتیں رہ گئی ہیں وہ ابھی کر لے مگر اسے اس گہری نیند سے جگانا بھی ظلم تھا۔ اس کے اوپر لحاف ڈالتے ہوئے وہ بھی آرام دہ بستر کے لالچ سے لڑ نہیں پایا۔

جانے کتنے وقت بعد جب سارے گھر والے اپنی اپنی رائے دینے اور تلخ کلامی اور صلح صفائی کے بعد اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو سعیدہ ہلکے سے دروازہ کھول کے اندر آئیں۔ وہ مسہری کے دونوں سروں پر ایک دوسرے کی طرف پشت کیسے سو رہے تھے۔ انھوں نے شہود کو اٹھایا اور قدسیہ کو وہیں سونے دیا۔

نادر کی حالت دیکھ کر سب کو تشویش ہوئی تھی لیکن جب سنا کہ شہود نے مارا ہے تو سب دل ہی دل میں جانتے تھے وجہ معقول ہی ہو گی۔ جب نادر نے کہا کہ وہ بس قدسیہ کے اس سے بات کرنے پر اتنا غصہ ہو گیا تو کسی کو یقین نہ آیا سوائے اس کی ممی کے۔ بی اماں ان سب سے بے خبر ہی تھیں ورنہ ان کے لیے مشکل ہوتیں۔

اگلی صبح اس نے اپنا بیگ کھولا جو ارویٰ نے تیار کیا تھا۔ اس میں سے نکلا سفید جوڑا دیکھ کے ارویٰ کی دور اندیشی اور چالاکی پر بے اختیار مسکرا دی۔ وہ اس کا سب سے سادہ، مہنگا مگر خوبصورت لباس تھا۔ سب کی متفقہ رائے یہ تھی کو وہ اس میں بے پناہ حسین لگتی ہے۔ ارویٰ نے اس کے ساتھ زیور چوڑیاں بھی رکھی تھیں۔

”پاگل!“ وہ ہنس دی۔ ارویٰ نے اس کی ’سسرال میں پہلے دن‘ والی قسم کی چھوٹی موٹی تیاری کی تھی۔

نہانے کے بعد بال بنائے اور باہر نکلنے سے پہلے اس نے کان کے آویزے بدل لیے۔

دروازہ بند کر کے باہر نکلی اور سامنے ہی شہود چلا آ رہا تھا۔ اسے اپنی تیاری بہت محسوس ہوئی۔ اس کا سلور کناروں والا سفید جوڑا اور گیلے بال، کان کے سلور جھمکے اور اسے دیکھتے ہی چہرے پر پھیلا تاثر، شہود کو اچھا لگا کہ وہ اس تیاری کے بعد اس کے سامنے جو محسوس کر رہی تھی وہ اس کے چہرے پر بکھرا تھا، کچھ نیا اور پیارا۔

قدسیہ کی نظر اس کے ہاتھ پر پڑی۔ انگلیوں کے جوڑ اب بھی جامنی تھے۔ اس کی نظر کے تعاقب میں اس نے بھی اپنے ہاتھ کو دیکھا۔

”تم نے پہلی بار دیکھا ورنہ نادر اور میں بچپن سے ایسے ہی لڑتے آ رہے ہیں۔“ اس نے اپنی بند مٹھی سامنے کی۔

”یہ کلر ٹھیک ہونے کچھ وقت لگتا ہے۔“ اس نے گویا قدسیہ کو تسلی دی کہ وہ تجربہ کار ہے۔

تبھی ملازمہ نے اطلاع دی کہ انھیں بلا رہے ہیں۔ ڈائنگ روم میں بانو کے علاوہ بہار اور تینوں امیاں تھیں۔

قدسیہ کرسی کھینچ کے بیٹھ گئی اور چند لمحوں بعد وہ اس کے بغل والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

نادر کی والدہ ظاہر ہے ناراض تھیں اور ان دونوں کو بری طرح گھور رہی تھیں۔ شہود کے بیٹھتے ہی وہ پوری آواز سے کرسی کھسکا کر اٹھی اور باہر نکل گئیں۔

”کیوں مارا اسے اتنی بری طرح؟“ بہار نے پوچھا۔ شہود نے شانے اچکا کر اسے معصومیت سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔

”اب تم بچے نہیں رہے ہو کہ اس طرح ہاتھا پائی کرو۔“ نیلوفر نے کہا۔

”چاچی وہ دعوت دیتا ہے آؤ مجھے پیٹو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”شہود!“ سعیدہ نے تنبیہی انداز میں پکارا اور سر ہلا کے مزید کچھ نہ کہنے کا اشارہ کیا۔

”تم وہیں تھیں نا۔۔۔؟“ بہار نے اسے مخاطب کیا۔

”کیا ہوا تھا؟“

”شہود نے پہل نہ کی ہوتی تو انھیں ساری عمر ایک لڑکی سے پٹنے کا طعنہ سننا پڑتا۔“ اس نے سکون سے کہا۔ شہود کو اس بار حیرانی نہیں ہوئی۔

اور قدسیہ نے سوچا وہ کسی کی احسان مند تھی نہ پابند جو سچ اور اپنے جذبات چھپاتی۔

”مجھ میں بدتمیزی برداشت کرنے کی قوت ذرا بھی نہیں ہے۔“ اس نے گویا وہاں موجود حاضرین کو جتایا۔

”نادر کو زبان پر قابو رکھنا آیا ہی نہیں۔“ نیلوفر نے پہلو بدل کے بیٹی کو دیکھا کہ وہ مزید کچھ نہ کہے۔

ملازمہ نے ان دونوں کے آگے ناشتہ رکھا۔

شہود کے آگے مشروب کا گلاس تھا اور اس کے سامنے آملیٹ اور پراٹھا۔ اسے صرف چائے کی طلب تھی مگر اس وقت سب سے بچنے کے لیے اس نے رکابی قریب کھینچی اور کھانا شروع کر دیا۔

”تم چند دن رکو گی نا؟“ سعیدہ نے اس سے پوچھا۔

”بس آج کا دن۔ شام میں چلی جاؤں گی۔ ارویٰ اور شاکر کا کالج ہوتا ہے وہ زیادہ ناغہ نہیں کر سکتے اور نہ نانا جان کو اکیلا چھوڑ سکتے ہیں۔“

سعیدہ اس سے اکیلے میں بات کرنا چاہتی تھیں مگر جب پوچھنے پر اس نے بی اماں کے کمرے میں جانے کا عندیہ دیا تو انھوں نے گفتگو آگے پر ٹال دی۔

بی اماں کی نرس انھیں دوائیاں دے رہی تھیں۔ وہ سلام کر کے دروازے میں ٹھہر گئی۔

”آجاؤ رک کیوں گئی؟“ انھوں نے ہاتھ اٹھا کے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

وہ سست قدموں سے چلتی اندر آگئی۔

”یہاں بیٹھو۔“ انھوں نے اپنے پلنگ پر ہاتھ رکھا۔ وہ جو دور صوفے پر بیٹھنے لگی تھی، پلنگ کے کنارے ٹک گئی۔

”ناشتہ ہو گیا؟“

”جی۔“

”رات میں ٹھیک سے نیند آئی؟“

”جی۔“ اس نے گزری رات کا تصور جھٹکا۔

”اب جلد تم بھی ہمیشہ کے لیے اس گھر میں آجاؤ گی۔“ ان کے چہرے پر لہجے سے زیادہ مسرت تھی۔

وہ ان کے لیے مسکرا دی۔

”کیا مجھے معاف کر کے سب بھلا دینا چاہیے؟ مگر ان کو تو اپنی غلطیوں، زیادتیوں کی سزا ابھی نہیں ملی۔۔۔ لیکن کیا سزا وہی ہوتی ہے جو ہمیں دکھائی دے؟ اور کیا میری تسکین ان کی سزا سے ہی مشروط ہے؟ ان کا کچھ نہیں بگڑا، سب کچھ تو میرے گھر والوں نے سہا۔ ماموں، خالہ، نانا جان اور امی۔ سب بکھر گئے، ہمیشہ دکھی رہے، ایک دوسرے سے خفا بھی۔ اور خالہ۔۔۔ کیا یہ ان کے ساتھ زیادتی نہیں ہو گی اگر میں ان کے جذبات اور احساسات مکمل نظر انداز کر دوں تو؟“

وہ ان کی باتوں پر مسکراتی اپنی سوچوں میں الجھی رہی۔

ان کے کمرے سے نکل کر جاتے ہوئے راہداری میں اسے بہار مل گئی۔

”تمھیں یہ بات پتا ہے۔۔۔“ اس نے بنا کسی تمہید کے کہا۔

”کہ بی اماں نے نادر اور شہود بھائی کے سامنے یہ شرط رکھی تھی، جو پہلے شجاع چاچا کی بیٹی کو ڈھونڈ لائے گا وہ اپنا پسندیدہ فارم ہاؤس اس کے نام کریں گی جس کے لیے وہ دونوں کب سے لڑ رہے تھے۔“ قدسیہ کو دھچکا لگا تھا مگر اس نے ظاہر نہیں کیا۔

”اور شادی کرنے پر کیا ملنا تھا؟“ اس کے سوال پر بہار واضح متعجب ہوئی۔

”قدسیہ شجاع احمد۔“ دائیں جانب سے شہود کی آواز آئی۔

بہار نے سٹپٹا کے شہود کو دیکھا جب کہ اس نے ہونٹ بھینچے۔

”اور کچھ کہنا ہے قدسیہ سے؟“ شہود نے پوچھا۔

بہار اسے گھورتی چلی گئی۔ وہ بھی جانے لگی تھی شہود نے سامنے آ کر راستہ روکا۔

”مجھ سے پوچھ لو جو بھی پوچھنا ہے۔“

”مجھے کیوں کسی سے کچھ پوچھنا ہوگا؟“ اس کے تیور بدل گئے تھے۔ وہ اس کے بازو سے نکل گئی۔ کچھ دیر بعد وہ سعیدہ کے کمرے میں آئی۔

”آنٹی مجھے گھر جانا ہے۔ ابھی خالہ کا فون آیا تھا وہ آ رہی ہیں اور انھیں کچھ علم نہیں ہے۔“ اس نے ایک ہی سانس میں جھوٹ گھڑا۔

”شہود چھوڑ دے گا تمھیں، میں کہتی۔۔۔“

”مجھے ان کے ساتھ نہیں جانا، میں نے اوبر بک کر لی ہے۔“

جب اس کی اوبر گیٹ سے باہر نکلی تو انھوں نے ساتھ کھڑے بیٹے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”بہار نے اسے فارم ہاؤس کی شرط بتا دی ہے۔“ اس نے مسکین صورت بنائی۔

”اب اسے منانا تمھارا کام ہے۔ آل دا بیسٹ۔“ انھوں نے بیٹے کا بازو سہلایا۔

☆☆☆☆

وہ گھر پہنچی تو اس کا جھوٹ سچ میں ڈھلا سامنے تھا۔ بہار کی بات پر اسے اس قدر طیش تھا کہ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چلی گئی تھی۔۔

شاکر اور اروی سر جھکائے خالہ کے سامنے کھڑے تھے اور وہ جس بات کو سوچ سوچ کر وہ قیامت مان چکی تھی بڑی آسانی سے ہو گئی۔

”تم نے مجھ سے چھپ چھپ کے دادی سے ملنا شروع کر دیا ہے؟“ توپوں کا رخ اس کی جانب ہوا۔

”نہیں خالہ ہم سب نے آپ سے چھپ کر شہود سے میرا نکاح کروا دیا ہے۔“ وہ سارا رستہ خود سے لڑتی جھگڑتی بگڑتی آئی تھی، اتنی بھری تھی کہ ان کے سامنے بنا سوچے سمجھے بول بیٹھی۔

خالہ کہاں اس بم کے لیے تیار تھیں، انھیں سکتہ ہو گیا۔ وہ تو بول کے دھاڑ سے دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ پیچھے اروٰی اور شاکر اپنی زندگی کے سب سے مشکل وقت سے گزرنے لگے۔ نانا جان کو خبر ہی نہ تھی گھر میں کیا چل رہا ہے۔

جب اس کے حواس ٹھکانے آئے اور احساس ہوا کہ وہ صحن میں کیا کر چکی ہے تو اروٰی اور شاکر پر ترس کھا کے باہر آئی۔ وہاں جانے طوفان سے پہلے والا سناٹا تھا یا بعد والا۔

"کہاں ہیں؟" اس نے باورچی خانے میں جھانکا جہاں اروٰی جانے کیا کر رہی تھی۔

"نانا جان کے پاس اور یہ دودھ ڈال دوں ابھی چائے میں یا بعد میں ڈالتے ہیں؟"

"ڈال کر پکنے دو اور خبر دار چولھا گندا کیا تو۔" وہ اسے تنبیہہ کرتی واپس پلٹی۔

دبے پاؤں نانا جان کے دروازے سے اندر جھانکا۔

"ماضی کی چپقلش اور کدورتوں کی وجہ سے خوش آئند مستقبل نظر انداز کرنا بے وقوفی ہوتی ہے بیٹا۔ تمھیں بھی علم ہے اس معاملے میں شجاع کے بھائی کبھی شامل نہیں تھے وہ بس ماں کے آگے بے بس تھے۔"

"یہ سب ڈھکوسلے ہیں ابا ورنہ امیر اور جوان اولادیں یوں بے بس نہیں ہوتیں۔" خالہ کی آواز سے لگ رہا تھا وہ لمبی بحث کے بعد تھک گئی ہیں۔

"تمھارا اپنا بھائی بھی تو باپ کے سامنے بے بس تھا۔۔۔ اگر وہ اڑ جاتا، شہر چھوڑنے سے منع کر دیتا تو میں کیا کر سکتا تھا؟ اس نے مرضی کے خلاف باپ کا ساتھ دیا مگر کیا تم کہہ سکتی ہو وہ خوش تھا؟ اپنی مرضی سے سب کر رہا تھا؟ اس نے تو آج تک مجھے معاف نہیں کیا۔ اسی طرح مان لو شجاع کے بھائی بھی خود کو معاف نہ کر سکے ہوں، اب تلافی کرنا چاہتے ہوں۔۔۔ مجبوری اور بے بسی کی زبان ہر کسی کے لیے الگ ہوتی ہے اس میں امیر غریب اور جوان بوڑھے کی تفریق بھی نہیں۔" اسے اپنے نانا جان پر پیار اور ترس ایک ساتھ آیا۔ وہ اپنی اولادوں کو صفائیاں دیتے، قائل کرتے تھکتے نہیں تھے۔

وہ دروازہ کھول کے اندر آئی۔ دونوں سنبھل گئے۔

"تو اب کیا سوچا ہے؟ رخصتی بھی خاموشی سے کر دیں گے؟" خالہ نے اس سے نظر پھیر کر والد کو دیکھا۔

"وہ تم سب اور بچے طے کرو کب اور کیسے کرنا ہے۔"

"ہمم۔" خالہ اٹھ کے باہر چلی گئیں۔

"اب میں کیا کروں؟ بہت ناراض ہیں خالہ؟" وہ ان کی جگہ بیٹھ گئی۔

"مان جائے گی۔" انھوں نے تسلی دی۔

خالہ اس سے ملے اور بات کیے بغیر ہی چلی گئیں۔

خالہ اس کی کالیں اور پیغام نظر انداز کرتی رہیں اور وہ شہود کے۔ ایک دن کے قیام میں جو چند خوبصورت لمحے آئے تھے، اب وہ مسلسل ان کی یاد کو جھٹکتی رہتی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا اس رشتے کا کیا کرے۔ وہ سوچتی رہتی کہ کاش اس وقت کسی بھی قیمت پر نکاح نہ کرتی، نانا جان کو منا کر کچھ دن کے لے روک لیتی۔

جب کہ گھر کا ماحول یہ تھا کہ اس کی رخصتی شادی بس خالہ کے مان جانے کے انتظار میں تھی۔

☆☆☆☆

خالہ کی ناراضی یونہی جاری تھی۔ شاکر کے مشورے پر اروی اور وہ نانا جان کو خالہ کے گھر لے گئے تھے کہ اس طرح ان کے یہاں جا کے منائیں گے تو وہ ناراض نہیں رہ سکیں گی۔ اسے ان دو دانش وروں نے گھر پر ہی چھوڑ دیا تھا کہ اس 'منانے' والے پروگرام کی پہلی اسٹیج پر اس کی غیر موجودگی لازمی ہے۔ اور اب دروازے پر کھڑے شہود کو دیکھ کر اسے ان کی پہلی اسٹیج کی فلاسفی خوب سمجھ آگئی تھی۔

"گھر میں کوئی نہیں ہے۔" اس نے دروازہ بند کرنا چاہا اور شہود نے پٹ کے درمیان جوتا رکھا۔

"تم تو ہو۔" وہ دروازہ کھولتا اندر آیا اور پیچھے دروازہ بند کیا۔

وہ ذرا دور جا کے ہاتھ باندھ کے کھڑی ہو گئی۔ شہود کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کے صحن میں رکھی کرسیوں کی طرف لایا اور ایک کرسی پر اسے بٹھا کے اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تم اپنے سوال نہیں کرو گی نہیں تو میں خود کو ایکسپلین کیسے کروں گا؟"

وہ چپ تیز نظروں سے دیکھتی رہی۔

"اچھا اس وقت کیا سوچ رہی ہو یہ تو بتاؤ۔"

"میں نے پہلے دن ہی جھوٹ کیوں نہ کہا کہ یہ زہرہ بانو کا گھر نہیں اور نہ میں شجاع احمد کی بیٹی ہوں۔"

"تمھارے اس سچ نے کتنی زندگیاں بدل دی ہیں تمھیں اندازہ ہی نہیں۔"

"ہاں کسی کو فارم ہاؤس مل گیا ہے۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ زندگی میں پہلی بار اسے بے وقعتی کا احساس جو ہوا تھا۔

"وہ بی اماں کی سلی سی شرط تھی تم نے دیکھا نا وہ مجھے اور نادر کو یونہی ایک دوسرے کے مقابل لے آتی ہیں تا کہ ہم بیسٹ کریں۔"

"جو آپ کو چاہیے تھا وہ مل گیا نا اب کیا بچا ہے۔۔۔" وہ ٹھٹھک کے رکی۔

"مجھے گھر تک لے جانے کے بعد بھی کچھ ملنا ہے؟"

"قدسیہ!" شہود نے اس کی مزاحمت کے باوجود اس کے ہاتھ جکڑے۔

”اٹس ٹوارلی ٹو سے کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔۔۔ لیکن میں جانتا ہوں یہ ایک دن ہونی ہے، مجھے بھی تمھیں بھی۔ تم مجھے پسند ہو، برا میں بھی تمھیں نہیں لگتا۔ ہم نے اس راستے پر قدم رکھے ہیں جہاں کچھ دور۔۔۔ اگلے موڑ پر ہی یہ ہمیں منتظر ملے گی۔ ان کی شرط اپنی جگہ لیکن جب مجھے پاپا نے کہا کہ واقعی بی اماں کو پوتی کی یاد ستاتی ہے، اس کی ضرورت ہے، ان کا کوئی اور برا ارادی نہیں ہے تب میں نے سنجیدگی سے تمھاری تلاش شروع کی بلکہ وہ تلاش نہیں تھی۔۔۔ ویسے یہ راز کوئی نہیں جانتا کہ مجھے تمھارا ایڈریس پاپا دیا تھا اور اگر ان سب میں مجھے فارم ہاؤس بھی مل گیا تو برا کیا ہے؟“ یہ گھر زہرہ کا تھا، اس سے بڑا انکشاف تھا مگر اس کا دل وہی اٹکا رہا۔

”میری قیمت ایک فارم ہاؤس۔۔۔؟“

”ربش! اب کیا اس وجہ سے میں وہ نادر کو دے دوں کہ تمھیں اس طرح محسوس ہو رہا ہے جو سراسر غلط ہے۔ مجھے پتا ہے نادر اس خوبصورت جگہ کو ویسے سنبھال نہیں سکتا جیسے میں۔ ایک قیمتی اثاثہ محض جذبات میں آ کر گنوا دوں جب کہ میں جانتا ہوں وہ کتنی محنت سے کھڑا کیا گیا ہے، یہ ناقدری ہو گی محنت کی، دولت کی، اپنے بڑوں کی۔“

اس نے سر جھکا کے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔

”لیکن یہ غلط ہے۔“

”ہو گا۔۔۔ لیکن کیا ہم سب ہی کہیں نہ کہیں غلط نہیں ہوتے؟ بی اماں غلط تھیں، میں فارم ہاؤس لے کر غلط ہوں، تم کارڈ لے کر غلط تھیں، پاپا اور چاچا تمھیں پلٹ کر نہ دیکھنے پر غلط ہیں۔۔۔ لیکن ہم ان غلطیوں کو بنیاد بنا کر دوسروں کو ہمیشہ کے لیے ولن نہیں بنا سکتے نا۔ وقت، انسان، خیالات، حالات، سب بدلتے ہیں تو پھر غلط اور غلطی پر اڑ کر اسے دائمی کیوں بنایا جائے؟ اس کی بنیاد پر ہمیشہ کے لیے تعلق کیوں توڑا جائے؟ رشتے سے موقع کیوں چھینا جائے؟“ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ اگر چاہتا تو کارڈ کو بنیاد بنا کے وہ بھی تو رشتہ ختم کر سکتا تھا۔ اسے غلط اور لالچی کہہ سکتا تھا۔

اسے اس فہرست میں نانا جان، ماموں بھی کھڑے نظر آئے اور خالہ بھی۔ جن کے ذہن میں اس کا ددھیال صرف نفرت کے قابل تھا۔ خالہ کے مطابق انھیں نادم ہونے اور تلاقی کی کوشش کا بھی حق نہیں تھا۔ نانا جان نے اس کی امی کے لیے باقی دو بچوں کے احساس بالکل بھلا دیے تھے۔ ماموں جو ایک غلط فہمی پر ناراض ہو کر فرائض اور حقائق دیکھنا بھول گئے تھے۔ اس کے نکاح کے وقت بھی نانا جان نے خالہ کے جذبات کو اہمیت نہیں دی تھی لیکن کیا نانا جان کی نیت غلط تھی؟ وہ کسی کا برا چاہتے تھے؟ خالہ اس کا برا چاہتی تھیں؟ ماموں اور نانا جان کے درمیان کا فاصلہ بے بنیاد تھا۔۔۔؟ نہیں مگر یہ سنگ دل زندگی ایسے ہی امتحان لیتی ہے۔ خود کو ’راست‘ کی شہہ سرخی کے نیچے رکھنا مقصد ہو تو انسان مشکل اور کڑے فیصلے کرے ہی نہ۔ دفاعی انداز میں کھیل کر آپ وقت کی بازیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہاں ’فیئر پلے‘ کا تمغہ ضرور مل سکتا ہے مگر کئی زندگیاں جو سنور سکتی تھیں وہ رل جاتی ہیں، کئی رشتے جو سنبھل سکتے تھے وہ بکھر جاتے ہیں۔ 'کولیٹرل ڈیمج' ہر فیصلے میں ہوتے ہیں۔

”کیا سوچنے لگیں؟“ شہود نے اس کے ہاتھ پر دباؤ ڈالا۔

"مطلب آپ کا کہنا ہیں ہم دونوں ایک سے برے ہیں؟"

شہود ہنس دیا۔

"مطلب تم مان گئی ہو۔" اس نے ہاتھ قریب کھینچنے چاہے مگر قدسیہ ہاتھ چھڑا کر کھڑی ہو گئی۔

"میں اس وقت مانوں گی جب آپ خالہ کو منالیں گے۔"

کچھ دیر بعد شہود کی کار خالہ کے دروازے کے آگے رکی تھی۔ دروازہ کھلا تھا۔ پہلے وہ اندر داخل ہوئی اس کے پیچھے شہود۔ کار کی آواز سن کے دانیہ صحن میں آئی تھی اور ان دونوں کو دیکھتے ہی اس کی سٹی گم ہو گئی۔ ماں کے غصے سے وہ سب ڈرتے تھے۔

"کون ہے؟" خالہ پوچھتی باہر آئیں اور دونوں کو دیکھ کر انھیں جھٹکا لگا۔ دانیہ چپکے سے اندر چلی گئی۔

تینوں خاموش تھے۔ آخر شہود اس کے پیچھے سے نکل کر خالہ کے قریب پہنچا اور سلام کیا۔ خالہ کا چہرہ مزید تن گیا۔

"میں شہود شفیع احمد۔۔۔ آپ جانتی ہی ہوں گی۔۔۔" وہ سنبھل کر، ٹھہر کر بات کر رہا تھا۔

"جب تک آپ کی ناراضی ختم نہیں ہو گی۔۔۔ قدسیہ کہہ رہی ہے وہ بھی نہیں مانیں گی۔" اس نے ذرا سا مڑ کے اسے دیکھا۔ خالہ نے سختی سے لب بھینچے کہ مبادا وہ کچھ بول ہی نہ دیں۔

"میں اپنے بڑوں کی جانب سے معافی ہی مانگ سکتا ہوں اور اپنے قول و فعل کے لیے زبان دے سکتا ہوں۔۔۔ یقین دلا سکتا ہوں، وعدہ کر سکتا ہو لیکن جب آپ کو یقین ہی نہیں ہو گا تو یہ سب بے معنی ہے۔۔۔ لہٰذا آپ ہی بتائیں میں کیا کروں کہ آپ مان جائیں اور قدسیہ بھی؟"

خالہ کی نگاہیں اس کی طرف اٹھیں جو دل تھامے انھیں دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کی آس اور آنکھوں میں ٹھہرا سہما تاثر انھیں رلا گیا۔

"اگر ہم نفرت ہی کرتے رہیں تو محبت کو موقع کیسے ملے گا؟ یہ بہت سے امکان کھا جاتی ہے، آپ امکان کے لیے در تو کھولیے۔۔۔" اسے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے حوصلہ ملا۔ قدسیہ کی آنکھیں بس برسنے کو تھیں۔ تبھی پیچھے سے نانا جان کی آواز آئی۔

"کون۔۔۔ شہود آیا ہے؟ وہاں کیوں رک گئے آؤ اندر آؤ۔" شہود نے خالہ کو دیکھا۔ ان دونوں کی آنکھیں ملیں۔

"دانیہ! انھیں اندر بٹھاؤ۔" خالہ نے کہا اور آنسو چھپاتی اندر چلی گئیں۔ قدسیہ ان کے پیچھے دوڑی۔ دانیہ اور ارویٰ اسے نانا جان کے ساتھ اندر لے جا رہی تھیں۔

"خالہ!" وہ طاہرہ سے لپٹ گئی۔

"سلطانہ بیگم کو میں نے معاف نہیں کیا ہے۔" وہ روہانسی تھیں۔

"تیرے سسرال بھی اسی وقت آؤں گی جب تو الگ رہے گی اور۔۔۔"

قدسیہ انھیں زور سے خود میں بھینچ کر روتے روتے ہنس دی۔

☆☆☆☆

شہود نے صحیح کہا تھا کہ نفرت امکان کھا جاتی ہے۔ اسے ددھیال ملا تھا، ایک اچھا سسرال، محبت کرنے والا شوہر۔ اروی اور شاکر کو تعلیمی میدان میں رہنمائی کرنے والا دوست اور بہنوئی، نانا جان کو اس کی طرف سے اطمینان اور سب سے اہم کہ خالہ کے اندر سکون اترنے لگا تھا، بہن کے ماضی کا زخم جو ہمیشہ ہرا رہتا تھا، بھرنے لگا تھا۔ انھیں سلطانہ بیگم سے اب بھی کوئی ہمدردی نہیں تھی مگر انھوں نے اپنی نفرت کے آگے دیکھنا شروع کیا تھا۔ وہ کبھی خالہ سے کہہ نہیں سکی مگر اسے لگتا تھا اگر خالہ نے دادی کے قصے زندہ نہ رکھے ہوتے، زہرہ کے ساتھ ہی وہ ماضی اور تکالیف بھی دفن کر دی ہوتیں تو اس کا اپنی دادی کے ساتھ تعلق کچھ بہتر ہو سکتا تھا۔ ابھی تو وہ بس ان کا دل رکھتی تھی، ان کی باتیں سن کر مسکرا دیتی تھی لیکن دل سے اسے انسیت اب بھی محسوس نہیں ہوتی تھی کہ خالہ کی باتوں کا اثر گہرا تھا، تاہم وہ اسے چھپا کے رکھتی تھی۔

"ہم ایک دن ماموں کو بھی منا لیں گے دیکھنا۔" وہ خالہ سے کہتی۔ اس نے نانا جان کے ساتھ کبھی کبھی ان کے گھر آنا جانا شروع کیا تھا کہ غلط تو کہیں نہ کہیں سب ہی تھے تو کوشش بھی جنھیں توفیق ہو کرنی ہی چاہیے۔

اس نے دروازہ کھولا جانتی تھی دوسری جانب کون ہو گا۔

"جی کہیے۔" اس نے دروازے کا پٹ تھامے مصنوعی سنجیدگی سے سوال کیا۔

"مسز قدسیہ شہود احمد کا گھر یہ ہی ہے؟" وہ بھی اس کھیل کا حصہ بنا۔

"جی۔"

"کیا ان سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"نہیں۔" قدسیہ نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

شہود، اس کا دروازے پر رکھا ہاتھ ہٹاتے ہوئے اسے لیے اندر آیا۔

"کیوں کہ وہ پانچ ہفتہ پہلے یہاں سے رخصت ہو کر سسرال چلی گئی ہے۔" شہود کی بات پر وہ ہنس دی۔ اسے بھی پہلی ملاقات یاد تھی۔

"مگر بے چارے ہزبنڈ کو اکیلا چھوڑ کر یہاں چلی آتی ہے۔"

"ہزبنڈ بھی تو بے اچاری کو لینے دوسرے دن ہی آ جاتے ہیں۔" اس نے شکوہ کیا۔

"دونوں بے چارو!" دروازے سے اروی کے جھانکا۔

"ہمارے پیٹ کے چوہے مزید یہ رومانس برداشت نہیں کر سکتے۔"

”رومانس؟ کہاں؟ کدھر؟“ شہود نے کہا۔

”ہمارے لیے تو یہ ہی ہے۔“ اس نے بے چارگی سے کہا۔ اندر سب کھانے پر شہود کا انتظار کر رہے تھے۔ آج قدسیہ کو اس کے ساتھ واپس جانا تھا۔

”اور اس سے زیادہ رومانس کی اس گھر میں ممانعت ہے، اس لیے جلدی آئیں۔“ وہ اندر غائب ہو گئی۔

”ایک اور وجہ تمھیں یہاں رکنے نہ دینے کی!“ شہود نے جتایا۔

”ڈونٹ وری۔ میں نے آپ کے لیے سب کے سامنے، کھلے عام رومانس کا انتظام کیا ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑے ہال کی اور بڑھی۔

ان کے علاقے میں چند دنوں سے پینے کے پانی کا مسئلہ تھا اور چوں کہ آج دعوت تھی لہٰذا دستر خوان پر پانی کی بند بوتلیں رکھی تھیں۔

شہود ان پر نظر پڑتے ہی قہقہہ لگا کر ہنسا۔ سارے حاضرین اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔

ختم شد۔

☆☆☆☆